ہوا کا رُخ

(مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

(غیر مطبوعہ مضامین کے سلسلے کی ایک کڑی)

عورتوں کی آزادی اور ترقی سے متعلق ہمارے لیڈروں کے نظریات

ہوا کے رُخ کا اندازہ کرنے کے لئے ہم پہلے پاکستان کے بعض چوٹی کے لیڈروں اور بعض لیڈر خواتین کی تقریروں اور بیانات کے اقتباسات درج کرتے ہیں تاکہ خود ان کے الفاظ سے واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ یہ حضرات اس ملک کی خواتین کو کس راستہ پر لے جانا چاہتے ہیں اور ان کی اجتماعی و سیاسی ترقی سے متعلق ان کے ذہنوں میں وہ کیا منصوبے ہیں جو انہوں نے اپنے زعم کے مطابق عین اسلام سے اخذ کئے ہیں۔

۲۴ جنوری ۱۹۴۹ء کو یونیورسٹی ہال لاہور میں مغربی پنجاب زنانہ مسلم لیگ اور پاکستان زنانہ رضاکار سروس کے زیر اہتمام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے جناب لیاقت علی خاں صاحب وزیر اعظم پاکستان نے فرمایا:-

"عورتوں پر — بالخصوص پڑھی لکھی اور پردے کی قید سے آزاد عورتوں پر — ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ انہیں پاکستان کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی خاطر ہر قربانی کے لئے تیار رہنا چاہئے اور اپنی تعلیم اور آزادی سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی مثال قائم کرنی چاہئے کہ دنیا دیکھ لے کہ ایک چاردیواری میں مقید رہنے والی عورت اور اس عورت میں کیا فرق ہوتا ہے جو اپنی تعلیم کی مدد سے اپنے ملک اور اپنی قوم کو مضبوط بنانے کی جدوجہد کرتی ہے۔ .... جب میں اپنے ہاں کی عورتوں کو بھی مردوں کے ساتھ پاکستان کے استحکام کے لئے کوشاں دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ یہ بات بڑی ہی

مسرت بخش ہے کہ ہماری بہنوں کی ایک کثیر تعداد زنانہ نیشنل گارڈز میں بھرتی ہو چکی ہے۔۔۔۔ جو لوگ عورتوں کو فوجی تربیت دیئے جانے کی مخالفت کرتے ہیں اور پرانی بوسیدہ صورتِ حال ہی کو جاری رکھنا چاہتے ہیں انہیں ذرا سرحد کے پار ان ہزار ہا چھینی ہوئی عورتوں کے حال پر نظر کرنی چاہیئے جو پاکستان کی راہ تک رہی ہیں۔ اگر وہ بدقسمت عورتیں اسلحہ کے استعمال سے واقف ہوتیں تو وہ چھینے جانے کے بجائے اپنے ناموس کی حفاظت میں کٹ مری ہوتیں۔"[1]

عورتوں کی آزادی کے بارہ میں جناب لیاقت علی خاں صاحب نے فرمایا:-

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں عورتوں کے لئے مکمل آزادی کے معاملہ میں آپ سے متفق ہوں۔ مرد عورتوں کو آزادی دیئے جانے کے خلاف نہیں ہیں۔ جو بعض مرد اس کے بظاہر مخالف معلوم ہوتے ہیں انہیں دراصل کچھ منفرد غلط مثالوں[2] نے مذبذب بنا دیا ہے۔ آپ لوگوں کو آزادی صحیح طور پر استعمال کرنا چاہیئے۔"

خواتین کے سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے وزیر اعظم صاحب نے فرمایا:-

---

[1] کس قدر صحیح فرمایا وزیر اعظم صاحب نے۔ پچھلی جنگِ عظیم میں روس، فرانس، اٹلی، جرمنی، پولینڈ، جاپان وغیرہ ملکوں میں اتنی لڑائیاں ہوئیں، مگر کسی عورت کو کوئی شخص ہاتھ نہ لگا سکا۔ اس لئے کہ پردے کی لعنت وہاں نہ تھی اور عورتیں اسلحہ کے استعمال سے واقف تھیں۔ خود ہمارے اسی برِعظیم میں دیکھ لیجئے۔ عورتیں صرف مسلمانوں ہی کی چھینی گئیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کی عورتوں کے چھینے جانے کا ایک واقعہ بھی پیش نہ آیا۔ اس لئے کہ پردے کی لعنت تو ہم پر مسلط تھی۔

[2] منفرد غلط مثالوں سے وزیر اعظم صاحب کا اشارہ غالباً آزادی کے سوءِ استعمال کے ان شاذ و نادر واقعات کی طرف ہے جو بے پردہ سوسائٹی میں کہیں ہزاروں لاکھوں میں کبھی سوءِ اتفاق سے پیش آجایا کرتے ہیں مثلاً انگلستان کی سرکاری رپورٹ متعلق ولادت بابت ۱۹۴۶ء میں درج ہے کہ اس سال ہر آٹھ بچوں میں صرف ایک بچہ حرامی پیدا ہوا۔ (یہ صرف ان ناجائز ولادتوں کی تعداد ہے جو غیر شادی شدہ عورتوں کے بطن سے ہوتی ہیں اور جن کا حکومت کو علم ہو سکا ہے) وزیر اعظم صاحب کا منشا یہ ہے کہ اس طرح کے منفرد واقعات نے بعض مردوں کو بظاہر شبہ میں ڈال دیا ہے ورنہ عورتوں کی مکمل آزادی سے کس بدبخت کو اختلاف ہو سکتا ہے اور اس کی برکات میں کون کافر شک لا سکتا ہے!

"اپنے سپاس نامہ میں آپ لوگوں نے کہا ہے کہ عورتوں کو مرکز اور صوبوں میں معقول نمائندگی دی جائے۔ ہر چند میں آپ کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس صوبہ کے وزارتی جھمیلوں کی موجودگی میں آپ کو سردست اس سے الگ ہی رہنا چاہئیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں تک ممکن ہو گا عورتوں کو حکومت کے ہر محکمہ میں پوری نمائندگی دی جائے گی"

تقریر کے آخر میں وزیراعظم صاحب نے ٹیپ کا بند یہ ارشاد فرمایا:-

"پاکستان اس غرض کے لئے حاصل کیا گیا ہے تاکہ دنیا کو اسلامی اصولوں پر قائم شدہ ریاست کا نمونہ دکھایا جا سکے۔" (سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۴۹ء)

ہمارے وزیر خزانہ ملک غلام محمد صاحب جو ماشاءاللہ پاکستانی کابینہ کے دماغ سمجھے جاتے ہیں اور اپنی مذہبی بصیرت پر انہیں خود بھی بڑا اعتماد ہے اور بہت سے دوسرے حضرات کو بھی اس باب میں ان سے بڑی خوش گمانی ہے وہ عمر بھر کے غور و مطالعہ کے بعد عورتوں کے معاملہ میں جس نتیجہ تک پہنچے ہیں اس کا اظہار کراچی میں بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس کے آخری اجلاس میں ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں فرمایا:-

"مجھے افسوس ہے کہ ہماری اس کانفرنس میں کہیں سے کوئی عورت نمائندہ بن کر نہیں آئی[1]۔ مجھے پوری پوری امید ہے کہ طہران میں منعقد ہونے والی کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں کچھ نہ کچھ عورتیں بھی نمائندہ حیثیت سے ضرور شریک ہوں گی۔ اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت میں نے اس لئے محسوس کی کہ جب تک کسی ملک کی اقتصادی تعمیر میں عورتیں بھی پورا پورا حصہ نہ لیں اسکی اقتصادی حالت درست نہیں ہو سکتی۔ تمام مذاہب میں سے اسلام ہی تو تھا جس نے سب سے پہلے عورت کو سیاسیات، اقتصادیات میں عزت و احترام کا وہ مقام عطا کیا جو اس سے پہلے اسکو حاصل نہیں تھا۔ پس اسلامی ممالک کو چاہئیے کہ اپنے ہاں کی تمام تحریکوں میں عورتوں کو صف اول میں جگہ دے کر ان کے ساتھ انصاف کریں۔

---

[1] اس بینی شعور اور فہم کی داد دیجئے کہ پوری کانفرنس میں اسلامی نقطۂ نظر سے جس ایک چیز کی کمی رہ گئی تھی اسکو ہمارے وزیر مال نے کس طرح تاڑ لیا!

اس کے بغیر اقتصادی بحالی ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہوگی۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جہالت اور تحکمانہ ملائیت نے مسلمان عورتوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اب ہمیں ان کو اقتصادی بندھنوں سے بھی آزاد کرانا ہے اور (مردوں کے مقابل میں) احترام اور برابری کا وہ مقام بھی ان کو دلانا ہے جو اسلام کا تقاضا ہے۔[1]

آخر میں نہایت ادب کے ساتھ میں یہ بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ عمر بھر کے غور و مطالعہ[2] کے بعد اب یہ میرا ایمان ہو چکا ہے کہ اسلام کوئی جامد شے نہیں ہے۔ اسلام ایک زبردست طاقت اور ایک زندگی بخش قوت ہے۔۔۔۔ مستقبل کی تعمیر میں اس کا بہت اہم حصہ ہوگا۔ اس کی تعمیر کی ابتدا کی جا چکی ہے۔ اب ہم میں سے ہر ایک کو اپنا اپنا جائزہ برابر لیتے رہنا چاہئیے کہ جس کام کا بیڑا ہم نے اٹھایا ہے اس کے لئے آپ اپنے کو کس حد تک تیار کر رہے ہیں۔ ہمیں ان خیالات اور جہالتوں سے لڑنا ہے جو صدیوں سے ہم پر مسلط ہیں۔ مگر مجھے اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ اگر ہم نے اسلام کی صحیح روح کو پیش نظر رکھ کر کام کیا تو ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کے رہیں گے۔" (پاکستان ٹائمز لاہور ۹ دسمبر ۴۹ء)

بیگمات کے افکار و نظریات | اب بعض بیگمات کی تقریروں اور بیانات کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے جو اس ملک کی خواتین کی لیڈر ہیں (جنکو ارباب اقتدار کیجانب سے اس لیڈری کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے) اور جو مسلمان عورتوں کیلئے نمونہ اور مثال کی حیثیت سے بغیر کسی خرچ کے اس ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لئے پھرائی جا رہی ہیں کہ یہ ہماری ماؤں اور بہنوں کو دکھائیں اور بتائیں کہ ان کو کس نمونہ کی تقلید کرنی چاہئیے اور کیا بننا چاہئیے۔

اس زمرہ صالحات و طیبات کی گل سر سبد محترمہ بیگم لیاقت علیخاں ہیں۔ انہوں نے ۲۸ جنوری ۴۹ء کو جہلم میں کالا فوجی کیمپ میں جموں و کشمیر کے پناہ گزینوں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی تقریر میں فرمایا:

اب وہ وقت نہیں رہا کہ مسلمان عورتیں گھروں کی چار دیواری میں بند بیٹھی رہیں۔ اب انہیں اس

---

[1] دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست ہونے کی وجہ سے تمام ملک کی رہنمائی کا جو مقام پاکستان کو حاصل ہے اس کے پیش نظر ان کی یہ اقتصادی پروگرام کی بسم اللہ گویا آزادی نسواں کے جادو بروئے کار ہے۔

[2] اگرچہ جج صاحب نے یہ تصریح نہیں فرمائی کہ عمر بھر کس چیز کا مطالعہ فرمانے کے بعد وہ اس نتیجہ تک پہنچے ہیں مگر سیاق کلام دلیل ہے کہ وہ ظاہر یہی فرمانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے ساری زندگی اسلام کے مطالعہ میں بسر فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اسلام کے متعلق گل افشانی فرمانے اور ہر مجلس میں اس کی ترجمانی کرنے کے حق سے کس کی مجال ہے جو انہیں روک سکے۔ یہ تقاضا آزادی نسواں کے پروگرام کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ اب تک ہماری اس سب سے بڑی اسلامی حکومت نے ہیں لا تو ایسا تہ پر اس کی تعمیر کی آغاز کیا ہے اور یہی عام پبلک کے لئے نمایاں طور پر بیچ چیز آ رہی ہے اور اس چیز کی شہادت آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی رپورٹ سے بھی مل رہی ہے۔

خواب غفلت سے بیدار ہونا ہوگا اور گھروں سے نکل کر مردوں کے شانہ بشانہ قوم کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لینا ہوگا"[1]

مردوں کو مخاطب کر کے بیگم صاحبہ نے ارشاد فرمایا کہ "وہ اپنی عورتوں کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ وہ انہیں احساسات کا موقعہ دیں کہ وہ ان فنون کو سیکھ سکیں جن کی اہمیت ان کے اندر پائی جاتی ہو"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور مورخہ ۲۱ جنوری ۱۹۴۹ء)

انہی بیگم صاحبہ نے ۲۶ اپریل ۱۹۴۹ء کو لندن میں غیر ملکی اخبار نویس عورتوں کے سامنے پاکستانی عورتوں کی رفتار ترقی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اگرچہ (پاکستان کی) شہری عورتیں پردہ بھی کرتی ہیں اور نقاب بھی اوڑھتی ہیں تاہم اسّی فیصدی عورتیں جو دیہات میں رہتی ہیں وہ ایسا نہیں کرتی ہیں۔ نیز پردہ نشین عورتیں بھی اپنے مردوں پر ویسی ہی حاوی اور اپنے گھر کے معاملات میں ویسی ہی با اختیار ہیں جیسے کہ بے پردہ عورتیں"

آپ نے فرمایا کہ "مغرب میں بھی تو عورتوں کے مردانہ کارروائیوں اور مصروفیتوں میں حصہ لینے کا خیال ابھی نیا نیا ہی پیدا ہوا ہے[2]۔ بہر حال پردہ دیر سویر ختم ہو کے رہیگا۔ لڑکیوں کی نئی پود جن کی تربیت لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط درسگاہوں میں ہو رہی ہے وہ پردہ میں نہیں جائے گی"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۴۹ء)

کل پاکستان زنانہ ایسوسی ایشن کا ذکر اکثر اخباروں میں آتا رہتا ہے، اور ناظرین ایک حد تک اس سے واقف

---

[1] جموں اور کشمیر کی پناہ گزین عورتوں کے سامنے، جن کے پاس نہ مکانوں کی چار دیواری ہے نہ ستر پوشی کا کوئی سامان موجود ہے، بیگم صاحبہ کی یہ تقریر ممکن ہے بعض لوگوں کو بے محل معلوم ہو، مگر مقصد کا سچا عشق محل اور بے محل کی حدود کی پروا کب کرتا ہے!

[2] بیگم صاحبہ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ملک کی شہری عورتوں کے چہرہ پر یہ نقاب کے داغ دھبے کہیں کہیں جو نظر آجاتے ہیں ان کے سبب سے ہمیں ملامت کرنے میں جلدی نہ کیجئے۔ ابھی ہماری اسلامی ریاست کو وجود میں آتے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ ہماری خامیوں کا محاسبہ شروع کر دیا جائے۔ آخر مغرب کی عورتوں نے بھی تو اپنی موجودہ منزل تک پہنچنے میں کافی وقت لگائے۔ ہماری اسلامی حکومت پر بھی کچھ دن گزرنے دیجئے پھر اگر مخلوط درسگاہوں کی بدولت جاہلیت قدیمہ کا ایک نشان بھی باقی رہ جائے تو کہیئے!

ہوں گے۔ یہ عورتوں کی ایک نیم سرکاری انجمن ہے جس کی سرپرست ہز ایکسیلینسی بیگم خواجہ ناظم الدین اور مس فاطمہ جناح ہیں۔ بیگم لیاقت علی خاں اسکی صدر ہیں۔ اسکی شاخیں پاکستان کے ضلع ضلع میں قائم ہو چکی ہیں۔ ہر جگہ اس کی کرتا دھرتا سرکاری حکام کی بیگمات ہیں۔ حکومت پاکستان نے اس انجمن کو باضابطہ طور پر تسلیم کر کے یہ اعلان کر دیا ہے کہ جن معاملات کا تعلق عورتوں سے ہوگا ان معاملات میں حکومت اس انجمن سے مشورہ کئے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔ حکومت جس شفقت کے ساتھ اس کی سرپرستی کر رہی ہے اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اسکی کانفرنسیں بالعموم گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوا کرتی ہیں۔[1] اسکی جنرل سکرٹری بیگم جی۔ اے۔ خاں نے اسکی اغراض و مقاصد سے متعلق نمائندہ پریس کو جو بیان دیا ہے وہ ملاحظہ ہو:-

"یہ ایسوسی ایشن پختہ عزم رکھتی ہے کہ پاکستان کی عورتوں کو تہذیبی اعتبار سے دوسرے ملکوں کی عورتوں کی سطح پر کھڑا کرے۔ چنانچہ ایسوسی ایشن عنقریب اپنے نمائندوں کو دوسرے ملکوں میں اس غرض سے بھیج رہی ہے تاکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئیں کہ وہاں کی ایسی تنظیمیں کس طرح کام کرتی ہیں...... زینت خورشید جو ایسوسی ایشن کی رکن ہیں مذکورہ بالا مقصد کو پیش نظر رکھکر ہالینڈ جا رہی ہیں۔ جوں ہی ہمارے ارکان کی تعداد ۲۵ ہزار تک پہنچ گئی ہم اقوام متحدہ کی سماجی اور اقتصادی کونسل سے الحاق کی درخواست کر دینگی"۔

(پاکستان ٹائمز لاہور مورخہ ۲۵ جون ۱۹۴۹ء)

یہ انجمن جس قسم کی ثقافتی و تہذیبی ترقی اس ملک کی خواتین میں پیدا کرنی چاہتی ہے اس کا اندازہ بیگم طیب جی کی مندرجہ ذیل تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے اس انجمن کے ایک اجلاس میں ثقافتی ترقی کے ریزولیشن پر فرمائی:-

"ایک عام شکایت جو ان دنوں میں نے بہت سنی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں (پاکستان میں) عمدہ قسم کے گانوں کا کلی فقدان ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں گانے بجانے کے تمام استاد اور معلمین مسلمان ہی رہے ہیں تو یہ موجودہ صورت حال بہت ہی ستم ظریفانہ معلوم ہوتی ہے۔ مغلوں کے زمانہ میں گانا بجانا لڑکیوں کی تربیت کا ایک لازمی جز تھا اور معمولی گانا بجانا نہیں بلکہ نہایت

[1] ملاحظہ ہو دی سیکنڈ آئیر پاکستان ۱۹۴۹-۵۰ء صفحہ ۲۴۷ اور سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۵ فروری ۱۹۵۰ء

اونچے قسم کا ۔ یہ بڑے ہی افسوس کی بات ہے اور درحقیقت یہ ایک بہت بڑا خسارہ ہے کہ ہمارے زمانہ کی لڑکیاں معیاری اور پکے گانوں کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ان کی بڑی سے بڑی امنگ بس فلمی گیتوں کے سیکھنے تک محدود ہے۔ یہ گانے بھی اگرچہ اپنے عام انداز میں اچھے ہوتے ہیں مگر یہ گانوں کو حقیقی حسن صوت کے امتیاز کے قابل نہیں چھوڑتے۔

(دی سیکنڈ ایر شائع کردہ پاکستان پبلیکیشن، ص ۲۷۴)

اس ثقافتی ترقی کو شلا، پروئے کار لانے کے لئے ایک باضابطہ ادارہ بھی قائم ہو چکا ہے جس کو انسداد و ہی دین دار ہمارے وزیر خزانہ ملک غلام محمد صاحب نے اپنی سرپرستی سے مشرف فرمایا ہے۔ اس ادارہ کا اعلان ملاحظہ ہو:-

پاکستان اکاڈمی آف آرٹ

پاکستان میں ناچ سکھانے کی اسکیم

راولپنڈی ۲۱ نومبر مشہور پاکستانی رقاصہ[1] آزاد (؟) مس بیگم نزہت محمود نے بیان کیا کہ آئندہ سال کے شروع میں پاکستان میں جسم بنانے (   ) اور جسمانی حرکات میں تناسب و ہم آہنگی پیدا کرنے کا پہلا ادارہ قائم ہو جائے گا۔ اس کا ہیڈ مرکز کراچی اور ضمنی مراکز مغربی اور مشرقی پاکستان کے اہم شہروں میں ہوں گے۔ اس ادارہ کا مقصد پاکستانی عورتوں اور بچوں میں تندرستی، صحت اور جسمانی انضباط کا شعور پیدا کرنا ہے۔

بیگم محمود نے کہا کہ وہ اپنی اس اسکیم کے سلسلہ میں مسٹر غلام محمد صاحب وزیر خزانہ پاکستان اور بیگم لیاقت علی خان سے ملاقات کر چکی ہیں۔ ان دونوں صاحبوں نے اس کام میں پوری مدد دینے کا وعدہ کیا ہے[2]۔ میرے پیش نظر سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ رقص کو جو اکابر شاہان مغلیہ کی سرپرستی میں

---

[1] یہ نامہ نگار کی کوتاہی ہے کہ اس نے بیگم صاحب کو محض "پاکستانی رقاصہ" لکھا ہے۔ ورنہ وہ اپنے جذبات و حیات کے لحاظ سے تو "اسلامی رقاصہ" کے لقب کی مستحق ہیں اور ویسے بھی اب اس مملکت اسلامیہ میں کوئی شے غیر اسلامی کب رہ گئی ہے!

[2] بیگم صاحبہ نے کراچی کے اکابر و اکابرات سے شاید ہی ہیں معلوم ہوتا ہے کوتاہی کی ورنہ یہ بتی (؟) کی کیا خصوصیت ہے وہاں کے اکابر و صالحین میں سے کوئی بھی اس خالص دینی و اسلامی خدمت میں شرکت و تعاون سے پیچھے رہنے والا نہیں ہے۔

اپنے کمال کو پہنچ گیا تھا اور اب پاکستان میں رو بہ تنزل ہے پھر سے زندہ کیا جائے۔ اور بین الاقوامی نمائش فنون میں جو ۱۹۵۱ء میں لندن میں منعقد ہو رہی ہے پاکستان کو دنیا کے تہذیبی نقشہ پر جگہ دلائی جائے۔

اس عظیم الشان کام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پہلا قدم یہ ہوگا کہ آزوری راولپنڈی میں ۱۰ دسمبر ۴۹ء کو قرص و دیسجہ بنانے کے فن کی نمائش کریگی۔

اپنے اس ادارہ کے مقاصد کی تفصیل کرتے ہوئے آپ نے بیان کیا کہ ان کے پیش نظر پاکستانی خواتین کو صرف ناچ گانے کے فن ہی میں یکتائے روزگار بنانا نہیں ہے بلکہ ان کی شخصیتوں کو تہذیب کے رنگ میں رنگ دینا اور ان کو اس خاص سانچے میں ڈھال دینا بھی ہے جو قدرت نے ان کو عنایت کیا ہے۔ اس سے میرا مقصود ان کو معاشرہ میں اپنی اصلی جگہ حاصل کرنے اور آئندہ تعمیر ملت[2] کے کاموں میں اپنا پورا حصہ ادا کرنے کے قابل بنانا ہے۔

آپ نے کہا کہ اس ادارہ کا دائرہ عمل صرف ناچ اور گانا سکھانے ہی تک محدود نہیں ہوگا بلکہ یہ بہت سے دوسرے فنون مثلاً مصوری وغیرہ سکھانے کا بندوبست بھی کرے گا۔

خٹک ناچ کا ذکر کرتے ہوئے آزوری نے بڑے دعوے سے کہا کہ خٹک ناچ مسلمانوں کا ناچ[3] ہے یہ اپنی موجودہ طرز اور موجودہ کمال کو اکابر شاہان مغلیہ کی سرپرستی میں پہنچا۔ پاکستانی رقاصہ

---

[1] تاریخ کا جو شدبد تھوڑا سا مطالعہ ہمارا ہے اسکی بنا پر یہ عرض ہے کہ یہ فن شریف مغل سلاطین کے اس دور میں اپنے کمال پر پہنچا تھا جو درحقیقت سلاطین کے زوال کا دور آخر تھا اور بیگم صاحبہ ہمارے دور طفولیت ہی میں اس کمال کی متمنی ہیں۔ عجب! ابتدائی نقطے پر یہ حال ہے تو دیکھئے اسکی انتہا کیا ہو:

[2] اس مقام سے سرسری نہ گذر جائیے بلکہ یہاں اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ ہمارے معماران ملت کے نزدیک "تعمیر ملت" کی اصطلاح کا اصلی مفہوم کیا ہے اور ملت اسلامیہ کی تعمیر درحقیقت کن اجزاء سے ہوتی ہے

[3] یہ بھی بیگم صاحبہ کی عنایت ہے کہ انہوں نے اسے صرف مسلمانوں کا ناچ قرار دیا ورنہ انہیں تو اسے خالص اسلامی ناچ کہنا چاہیئے تھا۔

(آذوری) نے ہندوستان کے اس دعوے کی کہ کتھک ناچ ان کی چیز ہے پرزور تردید کی اور اسیات کو بہت زور دے کر کہا کہ اس ناچ کو ہمیں ہندوستان والوں سے پھر حاصل کرنا ہے۔[1]" (سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور مورخہ ۳۰ نومبر ۴۹ء)

ان بیگم صاحبہ کے متعلق ایک اور اعلان بھی قابل ملاحظہ ہے جو ۸ فروری ۵۰ء کے "احسان" لاہور میں شائع ہوا ہے:-

"کراچی ۴ فروری۔ ملک میں آرٹ کو ترقی دینے کے لئے عنقریب اکاڈمی آف آرٹ کا قیام عمل میں آجائے گا۔ مادام آذوری جو مشہور آرٹسٹ ہیں انہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کو بتایا ہے کہ ملک کو زیادہ آرٹ آشنا بنانے کے لئے تحریک جاری کی جائے گی تاکہ پاکستان آرٹ کے لحاظ سے بھی دنیا کے ممالک میں اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے۔ آپ نے کہا کہ دنیا کی کوئی قوم آرٹ کے بغیر ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتی ...... آپ نے مزید کہا کہ توقع ہے کہ پاکستان کے وزیر خزانہ اس نئی اکاڈمی کے صدر ہوں گے۔ مادام آذوری نے کہا کہ دنیا کے تمام ممالک میں آرٹ کی ترقی کے لئے ان کے اپنے قومی تھیٹر ہیں لیکن پاکستان میں کوئی تھیٹر نہیں۔ پاکستان کو ان تھیٹروں کی بہت ضرورت ہے۔"

ان اعلانات میں بار بار آرٹ کا لفظ جو استعمال ہوا ہے اس سے ناظرین کو کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ اس طائفہ کی اصطلاح میں آرٹ سے مراد ناچ ہی ہوتا ہے۔ نیز ان اعلانات میں جس آرٹ اکاڈمی کے قیام کی بشارت دی گئی ہے اس کے باضابطہ قیام کا اشتہار بھی آذوری صاحبہ کے رقص کی تصویر کے ساتھ ۹ فروری ۵۰ء کے ڈان، کراچی میں شائع ہو چکا ہے اور اس اشتہار پر "زیر سرپرستی آنریبل مسٹر غلام محمد وزیر مال" کے الفاظ بھی اہل پاکستان کی آنکھیں روشن کرنے کے لئے ثبت ہیں۔ یہاں پھر ایک مرتبہ پلٹ کر مسٹر غلام محمد کی اس تقریر کو

[1] پاکستان کے تمام مسلمانوں کو آذوری صاحبہ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے ایک ایسے عظیم الشان قومی نقصان پر ہم کو متنبہ کیا ہے جس کی طرف اس سے پہلے کسی کی بھی توجہ نہیں گئی۔ واگہ کے اُس پار کے نقصانات کا جب بھی ذکر آیا تو کسی نے ہزاروں ہماری بیٹیوں کی بے حرمتی کا ماتم کیا، کسی نے مساجد اور مزارات کا ماتم کیا، کسی نے ایک آہ سرد کے ساتھ دینی مدارس اور اسلامی کتب خانوں کو یاد کیا، لیکن اسے اسلامی بے حسی کہیے یا دینی بے خبری کہ ہمارے بزرگوں اور چھوٹوں میں سے کسی کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہمارا خالص قومی و اسلامی ناچ "کتھک" بھی واگہ کے اس پار ہی رہ گیا اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ظالم ہندو

ہم سے اپنا سمجھے رہے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کا حق ہے... خدا بھلا کرے بیگم آذوری کا کہ ہم اس کو بھی واپس لئے بغیر پاکستان نہیں بننے دیں گے۔

پڑھ ڈالئیے جو انہوں نے اسلامی اقتصادی کانفرنس میں کی تھی۔ یہ ہے عمر بھر کے مطالعۂ اسلام کا نچوڑ:

زنانہ نیشنل گارڈز

پاکستان زنانہ نیشنل گارڈز کو جو اہمیت دی جارہی ہے اور اسکی پریڈوں اور سلامیوں سے اس ملک کے ارباب اقتدار اور لیڈر صاحبان کو جس درجہ دلچسپی ہے اسکو پیش نظر رکھ کر یہ کہنا شاید بیجا نہ ہوگا کہ اس وقت دفاعی نقطۂ نظر سے اگر اہمیت ہمارے ملک میں اگر کسی چیز کو حاصل ہے تو اسی چیز کو حاصل ہے۔ ہمارے [illegible] دنیا کے ارکین [illegible] مصروفیت پر لگا ہوئے ہیں، وہ کسی چیز کے لئے وقت نکال سکیں یا نہ نکال سکیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ زنانہ نیشنل گارڈز کی پریڈوں اور سلامیوں کو قضا ہونے دیں اور یہ پریڈیں اور سلامیاں جن اسلامی آداب و قواعد کے اہتمام کے ساتھ منعقد ہوتی ہیں اس کے متعلق چند رپورٹیں ملاحظہ ہوں:۔

"قیام پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان زنانہ نیشنل گارڈز کی طرف سے ڈھاکہ اسپورٹس ایسوسی ایشن کے وسیع میدان میں قواعد، کھیل اور رسہ کشی کا مظاہرہ کیا گیا۔ صوبہ کے گورنر سر فریڈرک بورن نے زنانہ نیشنل گارڈز کی سلامی قبول کی اور انعامات تقسیم کئے۔ نیشنل گارڈز کی جماعت میں شہر کے بعض مقتدر حضرات کی بیگمات اور کالج کی طالبات شریک ہیں اور باوجود روزمرہ کی مصروفیت کے یہ خواتین اس قومی ادارہ میں بہت دلچسپی کا اظہار کرتی ہیں۔ اس کے قیام کی پہلی سالگرہ کے موقع پر نہ صرف ڈھاکہ بلکہ دوسرے اضلاع کی خواتین بھی اسپورٹس میں شریک ہوئیں۔ پنجاب رجمنٹ کے بینڈ کے ہمراہ سفید وردیوں اور سبز دوپٹوں میں ملبوس خواتین نے مارچ پاسٹ کی رسم ادا کی۔ اس کے بعد سوگن کی دوڑ، لانگ جمپ، لمبی چھلانگ، رسہ کشی اور دوسرے کھیلوں کے مظاہرے کئے گئے۔ اس موقع پر ہندوستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر مسٹر سنتوش کمار باسو، میجر جنرل ایوب خاں اور دوسرے اعلیٰ فوجی اور سول افسران بھی موجود تھے"۔

(نوائے وقت ۱۶ مارچ ۴۹ء)

پچھلے دنوں اس زنانہ نیشنل گارڈ کے ایک دستہ کو "مکہ اور مدینہ" کی سند تصدیق بھی حاصل ہوگئی۔ سعودی عرب کے جو نمائندے بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے انہوں نے ایک "چاق چوبند" دستہ کی پریڈ دیکھی اور نہ صرف اسکی تحسین فرمائی بلکہ یہ امید ظاہر کی کہ سعودی عرب کی خواتین بھی اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کریں گی۔ پاکستان کے مسلمان مکہ اور مدینہ کے فتووں کو ہمیشہ آخری دینی سند کی حیثیت دیتے رہے ہیں۔ (علمبردار)

کتاب وسنت کے دو ٹوک فتوے کے بعد بھلا اب کسی کو زنانہ نیشنل گارڈ کے کسی پہلو پر نکتہ چینی کے لئے کاہے کو لب ہلانے کی اجازت دیں گے۔ اصل خبر بالفاظہا ملاحظہ ہو:۔

"کراچی ۹ دسمبر آج کراچی میں پاکستان زنانہ نیشنل گارڈ کے ایک چاق و چوبند دستہ نے پریڈ کی۔ بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس میں شریک ہونے والے سعودی عرب کے ارکان وفد اور پاکستان میں سعودی عرب کے مدار المہام نے پریڈ کی سلامی لی۔

سعودی عرب کے وفد کے لیڈر نے اس تقریب کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی خواتین قومی زندگی میں مردوں کے دوش بدوش جس طرح کام کر رہی ہیں ان شاء اللہ سعودی عرب کی عورتیں بھی اپنے فرائض اسی تندہی سے انجام دیں گی۔" (نوائے وقت ۱۱ دسمبر ۱۹۴۹ء)

اس زنانہ نیشنل گارڈ کی تمام تربیت مرد فوجی افسروں کے سپرد ہے اور وہ ان دوشیزاؤں کی تربیت جن شرعی و اخلاقی ذمہ داریوں کے ساتھ کر رہے ہیں اور اس کے جو نتائج سامنے آ رہے ہیں اس کے متعلق ایک واقف حال کی شہادت ملاحظہ ہو۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے اپنی ۲۳ اپریل ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں اپنے ایک مراسلہ نگار "حقیقت پسند" کا مندرجہ ذیل مراسلہ شائع کیا ہے:۔

"جناب من!

بیشتر اس کے کہ آپ تنبیوں اور پردے کی بحث ختم کریں، کیا آپ ایک حقیقت پسند شخص کو بھی اپنے احساسات پیش کرنے کا موقع دیں گے۔

فوج سے متعلق اپنے ۳۰ سالہ تجربہ کی بنا پر میرا یہ خیال ہے کہ فوج کے صرف وہ افسر عورتوں کے آوارہ پھرنے کے حق میں ہیں جو محض جنگی ضرورت کی پیداوار ہیں ...... یہ لوگ نوجوان ہیں اور عورتوں کی یہ آزادی اس لئے چاہتے ہیں تاکہ جہاں موقع میسر آئے یہ عورتیں ان کی تفریح کا سامان بن سکیں۔ ان کے ہاں کھانے کی میزوں پر سب سے زیادہ پردہ ہی بحث کا موضوع ہوتا ہے اور یہ لوگ تصویر کا دوسرا رخ کبھی دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

میں کیپٹن ظفر اللہ محمود کے ہم خیال دوسرے لوگوں کی توجہ انہی دنوں کی صرف اس خبر کی طرف

مبذول کرانا چاہتا ہوں جس میں ان زنانہ نیشنل گارڈوں کا ذکر تھا جن کا معاملہ نرسنگ اور دوسرے ڈاکٹری شعبوں میں بھرتی کے لئے زیرِ غور تھا اور اسی سلسلہ میں ان کے ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس ڈاکٹری معائنہ کا خوفناک نتیجہ بیان کرنے سے میں دانستہ احتراز کرتا ہوں۔ یہی ایک بات ہمارے سمجھدار دوستوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے[1]۔ آخر اس کی وجہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ (حقیقت پسند) لاہور

اگر آپ یہ اندازہ کرنا چاہیں کہ دفاع ملکی اور ملکی خیرات کے خشک و بے مزہ اور کڑھے کیسلے کاموں کو ہماری اس زنانہ نیشنل گارڈ نے کس قدر لذیذ اور پُرکشش بنا دیا ہے تو اس کے لئے اس کی تیسویں ٹبالین کے اس تفریحی پروگرام کی روئداد ملاحظہ فرمایئے جو کنگ ہال میں زیرِ سرپرستی بیگم لیاقت علی خاں ۲۷، ۲۸، ۲۹ اگست کی تاریخوں میں منعقد ہوا۔ یہ روئداد ڈان میں اس کے نامہ نگار کے قلم سے شائع ہوئی ہے۔ نامہ نگار لکھتا ہے :-

" پاکستان زنانہ نیشنل گارڈ کا تیسواں بریگیڈ گذشتہ تین روز سے ایک نایاب نظارۂ جمال فراہم کر رہا ہے۔ لوگ جب کسی نیک مقصد میں مدد کے لئے خیراتی فنڈ کا کوئی تماشہ دیکھنے جاتے ہیں تو ٹکٹ خریدتے ہوئے عموماً وہ کسی اونچے معیار کی توقع نہیں رکھتے اس وجہ سے ان کے لئے یہ پُرمسرت اور تعجب انگیز امر تھا جب انہوں نے دیکھا کہ موسیقی، رنگ اور زریں ملبوسات کا ایک طوفان ان پر امنڈ پڑا۔۔۔۔۔۔

تماشہ کی ابتداء سازندوں کے ایک طائفے کی۔ نوخیز، خوش جمال اور خوش پوشاک لڑکیاں ستار، سرانج، وائلن اور بانسری پورے کمال فن کے ساتھ بجا رہی تھیں۔ یہ انبوہ جمال، موسیقی دیکھنے والوں اور سننے والوں کے لئے جنت نگاہ و فردوس گوش تھا۔ پھر چھ ماہ وش لڑکیوں نے مغل ناچ شروع کیا۔ یہ ناچ حسن و شباب اور مسرت و انبساط کا پورا پورا مظاہرہ تھا۔ منی پوری ناچ تو کمال فن کا ایک نادر نمونہ تھا جو ایسے تفریحی تماشوں میں دیکھنے کا کم ہی اتفاق ہوتا ہے۔ مصری ناچ اپنی خصوصیات کے مطابق حرکاتی تیزی اور نغماتی ہم آہنگی کا ایک دلکش مرقع تھا۔ پھر پنجاب کا مشہور دیہاتی ناچ لڈی

---

[1] نامہ نگار صاحب کی یہ سادہ مزاجی قابلِ داد ہے کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ اس طرح کے خوفناک نتائج ان حضرات کی آنکھیں کھولنے والے ثابت ہوتے ہیں۔ یہی تو وہ چاہتے ہیں کہ یہ مبارک نتائج برآمد ہوں اور ان میں زیادہ سے زیادہ حصہ خود ان کا ہو۔

توبس طوفان نغمہ ورنگ تھا۔ ستار پر مسز نذیر احمد کا نغمہ تنہائی اور اس پر رنگ برنگ روشنیوں کا جھا آواز کے جادو کو دوبالا کر رہا تھا۔ پردہ کے پس منظر میں غالب کی غزل سے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ایسے دلآویز انداز میں گائی جا رہی تھی کہ دل کے تاروں کو مرتعش کیئے دیتی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔

رنگ و لباس اس تفریحی تماشہ کی دو بڑی خصوصیتیں تھیں۔ ان خصوصیتوں کا مظاہرہ سوزن کاری کی فیشن پریڈ کے ذریعہ کیا گیا۔ مسلمانوں کے مختلف قسم کے ملبوسات آب و تاب، ریشمی چمک اور جواہراتی دمک کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ دہلوی بیگمات اپنی ناممکن التقلید خصوصیات کے ساتھ، حیدرآبادی بیگم آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے پرشکوہ ملبوس میں: لکھنوی بیگم اپنے مخصوص ناز و ادا کے ساتھ جو واجد علی شاہی دربار کا طرۂ امتیاز تھا، رامپوری بیگم اپنے دل ربا انداز میں نئی پاکستانی خاتون تمدن کے لوچ کے ساتھ نئی تیزی اور نفاست لئے ہوئے، میمن اور سورتی بیگمات اپنے دلآویز کار چوبی ملبوسات کے ساتھ اسٹیج کے آر پار تھرک تھرک کر ایک ہوش ربا منظر پیش کر رہی تھیں۔

تماشہ کا اختتام درجن بھر عورتوں کی دل فریب قوالی سے کیا گیا۔ تصرف یہ کہ موسیقی اور نغمہ کسی بہتر سے بہتر قوالی کے معیار کا تھا بلکہ ان پُرفن عورتوں نے تو اپنے پُرسحر ناز و ادا سے قوالی میں کمال ہی کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کامیابی میں ان کے حسن و لباس کو بہت کچھ دخل تھا۔

نغمہ و رقص سے مرکب چار سین کا ایک پرمذاق ڈراما بھی پیش کیا گیا جس کا نام جیت تھا۔ یہ ایک مسلمان رئیس کے گھر کا نقشہ پیش کرتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ ہیروئن مسرت و انبساط کی تصویر تھی۔ مذاق اور شوخی و شرارت سے بھری ہوئی اداکاری اور فنکاری کا مرقع۔ تینوں منگیتر نہایت نمود آور نوجوان تھے لیکن جیتنے والا حمید تو وہی فاتح تھا۔۔۔۔۔۔۔۔

بیگم لیاقت علی خاں دلی مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے کمال مہربانی سے سرپرستی فرما کر اس تماشہ کو پیش کرنے کی ہمت افزائی فرمائی۔ یہ صرف انہی کی پرتجسس نگاہیں تھیں جنہوں نے بہت سے پوشیدہ جواہرات کو ڈھونڈ نکالا۔ آرٹ اور اس کے متعلقات سے ان کی دلچسپی نے ہماری معاشرہ

میں آرٹ اور موسیقی کو دوبارہ زندگی بخشی ہے

یہ تماشہ کہاں تک پسند کیا گیا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ تماشہ کے دوران میں تقریب قریب ہر پیشکش پر ریلیف فنڈ کے لئے عطیات کے اعلان ہوتے رہے۔

(ڈان مورخہ ۳۰ اگست ۶۴۰ء)

یہ ہے ہماری اس زنانہ نیشنل گارڈ کی تصویر جس کو اس وقت پاکستان کی دفاعی تیاریوں میں ملک کی اہمیت حاصل ہے، یہ ہے ہماری وہ فوج ظفر موج جس کے لئے قرآن و حدیث سے دلیلیں فراہم کی گئی ہیں کہ مسلمان خواتین رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جنگی کاموں میں حصہ لیتی تھیں، یہ ہیں وہ طریقے جن میں ماہر ہو جانے کے بعد ہماری بہنیں اور بیٹیاں دشمنوں کے چھکے چھڑا دیں گی اور یہ ہیں وہ اسلامی طریقے جن سے ہماری قوم کا جذبہ انفاق فی سبیل اللہ ابھرتا ہے اور جن سے کام لے کر وہ اپنے جہاد کے لئے روپے فراہم کرتی ہے!!

<u>زنانہ کالجوں کا رنگ</u> ہمارے زنانہ کالجوں کی لڑکیوں کو جس طرح اسلامیت کے رنگ میں رنگا جا رہا ہے اس کے ثبوت میں صرف مس فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور کا حوالہ دے دینا شاید کافی ہوگا۔ اخباروں میں آئے دن اس کالج سے متعلق ایسی تصویریں چھپتی رہتی ہیں جن میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے وزراء کے عظام یا حکام عالی مقام میں سے کوئی بزرگ بنہایت شان سے براجمان ہیں اور ان کے اردگرد کالج کی طالبات اور معلمات اس طرح جمع ہیں جس طرح شمع کے گرد پروانے جمع ہوں۔

لاہور کا اسلامیہ کالج خاردین ایک پردہ کالج ہونے کے لحاظ سے مشہور رہا ہے۔ اب ہمارے ارباب کار اسکو جو شکل دینے کی کوشش کر رہے ہیں اس کا اندازہ ذیل کے مراسلہ سے فرمایئے جو سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کی ۲۰ جولائی ۶۴۹ کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ایک طالبہ کا باپ اخبار مذکور کے ایڈیٹر کو لکھتا ہے۔

" جناب من،

زنانہ اسلامیہ کالج لاہور خالصتہً با پردہ ادارہ ہے اور اسی بنا پر اسے مسلمانوں سے عطیات اور امدادی خیراتی رقوم حاصل ہوتی رہی ہیں۔ مگر آج کل ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کالج میں ایسے مرد اور ان کے دوست احباب آتے ہیں جن کا اس ادارے سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ جب ایسے لوگ

کالج میں آتے ہیں۔ اور یہ وقتاً فوقتاً آتے ہی رہتے ہیں۔ تو لڑکیوں کو ننگے سر اور بے نقاب رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ میں ایک طالب کے والد کی حیثیت سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اب یہ کالج با پردہ نہیں رہا؟ تو پبلک کو اس سے آگاہ کیوں نہیں کیا گیا؟[1]

(ایم۔ اے۔ مجید قریشی۔ لاہور)

مخلوط کالجوں کا حال لڑکوں اور لڑکیوں کے مخلوط کالجوں اور اسکولوں کے متعلق ہر غیور مسلمان کو یہ گمان تھا کہ تہذیب شیطانی کی یہ لعنت قیام پاکستان کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کی جائے گی۔ لیکن اوپر بیگم لیاقت علی خاں کا بیان آپ پڑھ چکے ہیں کہ آزادی نسواں اور پردہ شکنی کے لئے جو جہاد انہوں نے شروع کر رکھا ہے اس میں اپنی ساری کامیابی کا انحصار وہ انہی کالجوں پر سمجھتی ہیں۔ انہی کالجوں کے اندر، ان کے خیال میں اس فوج ظفر موج کے افسر اور کمانڈر تیار ہو رہے ہیں جو اس ملک میں اس خالص اسلامی تہذیب کو قائم کریں گے جس کے لئے بیگم صاحبہ میلاد کی مجلسوں میں والہانہ انداز میں تقریریں فرمایا کرتی ہیں، اور جس کے قائم کرنے کے لئے ان کے محترم شوہر نے پاکستان دستور ساز اسمبلی میں مشہور قرارداد مقاصد پاس کرائی ہے۔

ان کالجوں میں پڑھنے والیوں اور پڑھنے والوں کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ ایک واقعہ یاد آ گیا ہے جس کو ہم محض اس خیال سے یہاں ذکر کرتے ہیں کہ اس سے فی الجملہ اندازہ ہو سکے گا کہ موجودہ تعلیم کس ٹائپ کے اشخاص تیار کرتی ہے اور کس ذہنیت اور کس مذاق کے لوگ ہیں جن کو اس نظام تعلیم میں یہ درجہ بخشا گیا ہے کہ وہ ہماری نوجوان نسل کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک مکتب میں بٹھا کر تعلیم دے رہے ہیں اور پھر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس سے اخلاق بگڑتے نہیں، بلکہ بن رہے ہیں۔

غالباً اپریل ۴۸ء کا واقعہ ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور ان کے بعض رفقاء کو پاکستان کے ایک کالج میں تقریر کے لئے دعوت دی گئی جو لڑکوں اور لڑکیوں کا مخلوط کالج تھا۔ جہاں کی تقریر سننے کے لئے

[1] نامہ نگار صاحب سے گذارش ہے کہ جب پبلک اتنی اندھی ہو جائے کہ دن دہاڑے اور ڈنکے کی چوٹ علانیہ جو کچھ کیا جا رہا ہے اسے نظر آ سکتا تو پھر لوگوں کو کیوں بتایا جائے۔ وہ تو اپنے سامنے "دنیا بیوقوفوں کی بستی ہے" The world is full of fools کا قاعدہ کلیہ رکھ کر چل رہے ہیں۔ اور ان کا اب تک کا تجربہ اسی قاعدہ کی تصدیق کرتا ہے۔

ہال میں جس طرح لڑکے جمع ہوتے اسی طرح طالبات بھی جمع ہوئیں اور تہذیب جدید کے آداب کے مطابق لڑکیاں ہال کی اگلی بنچوں پر بیٹھیں اور ایک آدھ کے سوا سب بہنیں بے نقاب تھیں۔ جب حاضرین اور مہمان اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو کالج کے پرنسپل صاحب معزز مہمان کے خیر مقدم اور حاضرین سے ان کے تعارف کے لئے کھڑے ہوئے اور اپنی فصیح و بلیغ تقریر کا آغاز انہوں نے ایک مصرعہ سے فرمایا جس کو اپنے ادبی ذوق اور اخلاقی حس دونوں پر انتہائی ظلم کر کے میں محض اس لئے نقل کر رہا ہوں کہ ناظرین اس سے عبرت حاصل کر سکیں۔ مصرعہ یہ تھا۔

۶- خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

پرنسپل صاحب نے یہ مصرعہ اس بے تکلفی سے پڑھ دیا گویا خطبہ مسنونہ تلاوت فرما رہے ہیں اور دوسروں کا تو پتہ نہیں مگر میرا جو حال ہوا اس کا اندازہ اس سے فرمایئے کہ باوجودیکہ اب اس واقعہ پر ایک مدت گذر چکی ہے لیکن آج بھی اگر اس اجتماع اور اس مصرعہ کا خیال آجاتا ہے تو مجھے ایسی شرمندگی ہوتی ہے کہ گویا اس مصرعہ کے پڑھنے کا جرم پرنسپل صاحب سے نہیں بلکہ مجھ سے ہی صادر ہوا تھا۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے مقصود کسی خاص کالج اور اس کے پرنسپل صاحب کو زیر بحث لانا نہیں ہے بلکہ مقصود محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن مخلوط کالجوں کی نسبت بیگم لیاقت علی خاں صاحبہ اور ہمارے ارباب کار کو یہ گمان ہے کہ ان کے اندر اس ملک میں آئندہ قائم ہونے والی تہذیب کے نمونے ڈھالے جا رہے ہیں ان کے طلبہ اور طالبات تو الگ رہے ان کے پرنسپلوں کے مذاق سلیم کا یہ حال ہے کہ ان کی صحبت سے ثقہ اور سنجیدہ لوگوں کو پرہیز کرنا واجب ہے۔

ڈرامے اور مینا بازار | آزادی نسواں اور پردہ شکنی کی اس تحریک ہی کو مقبول بنانے کے لئے ڈراموں، ناچ گانے کی مجلسوں اور مینا بازاروں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے جس کی ہر دلعزیزی اس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے کہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید پاکستان میں تہذیب و ثقافت نام ہی ان چند چیزوں کا رہ جائے گا۔ ڈراموں میں بیشتر زنانہ نیشنل گارڈز، کالجوں کی طالبات اور سرکاری اداروں کی پناہ گزیں لڑکیاں حصہ لیتی ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اس "آرٹ" کو فروغ دینے کے لئے ہمارے اندر سے ایک مستقل طبقہ اس تحریک کے کارکنوں کے

ہاتھ آگیا ہے جو عجب نہیں کہ بگڑتے بگڑتے ایک دن اسکو پیشہ بنا بیٹھے۔

مینا بازار پاکستان میں بیگم لیاقت علی خاں صاحب کی اولیات میں سے ہے۔ انہوں نے کراچی میں اس کا آغاز فرمایا اور اب یہ حال ہے کہ پاکستان میں قومی و ملی مقاصد کے لئے روپے اکٹھے کرنے کا اسکو واحد کامیاب ذریعہ خیال کیا جانے لگا ہے۔ پاکستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں کراچی کے مینا بازار کی تقلید کی جاچکی ہے اور جو شہر باقی رہ گئے ہیں وہ بھی جلد از جلد اس اسوۂ حسنہ کی پیروی سے سعادت اندوز ہونے کے لئے تیاریاں کررہے ہیں۔ یہ مینا بازار ظاہر میں تو اس غرض کے لئے منعقد کیے جاتے ہیں کہ ان سے قومی اغراض کے لئے روپیہ اکٹھا کیا جائے لیکن درحقیقت ان کا مقصد عورتوں کو اس آزادی و بے قیدی کی چاٹ لگانا ہے جو اس ملک کے ارباب اقتدار یہاں پھیلانے کے دل سے خواہشمند ہیں[1]۔ چنانچہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہاں مینا بازار کی ایک خاص قسم رائج کی گئی ہے جو پردہ شکنی کی تحریک اور جنسی جذبات کو ابھارنے میں خاص طور پر معین ہے اور چونکہ جنسی جذبہ کی زود اشتعالی اور اثر انگیزی معلوم ہے اور اس کے ذریعہ سے بڑی آسانی کے ساتھ عوام کی بھیڑیں اکٹھی کی جاسکتی ہیں اس لئے اس نسخہ کو پوری آزادی کے ساتھ استعمال کیا جارہا ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ قوم کو اگر ایک آزاد اور طاقتور قوم کی حیثیت سے زندہ رکھنا ہے تو اسکو ایسی تربیت دینے کی ضرورت ہے کہ اس کے اعلیٰ قومی اور مذہبی جذبات بیدار ہوں اور تمام پیش نظر مہمات میں وہی جذبات اس کی رہنمائی کریں۔ اگر ہر کام ناچ گانے کی محفلوں، ڈراموں اور مینا بازاروں ہی کے واسطہ سے لیا گیا تو کچھ عرصہ کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ایک جنسی جذبہ کے سوا اس قوم کے دوسرے سارے جذبات بالکل مردہ ہوجائیں گے یہاں تک کہ اگر آپ کوئی مسجد بنانے کے لئے بھی اس سے چندہ مانگیں گے تو اس وقت تک وہ آپ کو ایک حبہ نہیں دینے کی جب تک آپ پہلے اسکو مینا بازار کی سیر نہ کرائیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہاں یہ ذوق روز بروز ترقی کرتا جارہا ہے اور مینا بازاروں کی نت نئی قسمیں ایجاد ہوتی جارہی ہیں۔

۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ایک مینا بازار سیالکوٹ میں لگایا گیا تھا۔ اس کا افتتاح پاکستان کے کمانڈر انچیف سر

---

[1] اس کا اندازہ کرنے کے لئے ناظرین کو ۲۰ مارچ ۱۹۴۹ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں کراچی کے مینا بازار میں مسز بیگم لیاقت علی خاں صاحب اور ملک غلام محمد صاحب وزیر خزانہ پاکستان کی ملاقات کی ایک تصویر دیکھ لینا کافی ہوگا۔

ڈگلس بی گریسی نے فرمایا۔ اس کے پروگرام میں ایک دن عورتوں کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ اُس خاص دن کے متعلق ایک خاتون کا بیان ملاحظہ فرمایئے جو انہوں نے عینی مشاہدہ کے بعد اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع کرایا ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو سکیگا کہ پاکستان میں مینا بازاروں کا مقصد کیا ہے۔ خاتون مذکور لکھتی ہیں:۔

" جنابِ من !

سیالکوٹ چھاؤنی میں جو مینا بازار لگایا گیا تھا اس کے متعلق یہ اعلان کیا گیا کہ اس کا دوسرا دن عورتوں کے لئے خاص ہوگا۔ میں یہ اعلان ہی سن کر حیران رہ گئی تھی کیونکہ مینا بازار تو کہتے ہی اس بازار کو ہیں جو عورتیں عورتوں کے لئے لگائیں۔ لیکن جب میں اس مینا بازار میں گئی تو وہاں کا بڑا آدم ہی نرالا تھا۔ وہاں کی ہر چیز کو اپنی توقعات کے بالکل برعکس پایا۔ تقریباً سبھی دوکانوں اور اسٹالوں کو مرد ہی چلا رہے تھے اس احاطہ میں سب سے نمایاں چھ پولیس افسر تھے جو اس نمائش کے وسط میں براجمان تھے۔ اس سے بھی زیادہ مضحکہ انگیز وہ چار سی۔ ایم۔ پی کے آدمی تھے جو ہر طرف پھر رہے تھے۔ تقریباً سو آدمی مختلف ٹولیوں میں برابر گشت لگا رہے تھے "

بیگم ایم بشیر سیالکوٹ

(سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ ۱۹ دسمبر ۴۹ء)

بیرونی ممالک میں ہماری خواتین کا تعارف | آزادیٔ نسواں کی یہ تحریک اب اندرون ملک ہی تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ اسکی منادی دوسرے ممالک میں بھی شروع ہو گئی ہے۔ آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی ششماہی رپورٹ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی خواتین نے بیرونی ممالک سے اپنے تعلقات جس قدر وسیع کر لئے ہیں خود حکومت پاکستان بھی اپنے تعلقات اب تک اس قدر وسیع نہیں کر سکی ہے۔ یہاں تک کہ بعض وہ اخبارات بھی جو اس تحریک کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش ہیں، اس وسعتِ تعلقات کو دیکھ کر گھبرا اٹھے ہیں اور عورتوں کو مشورہ دینے لگے ہیں کہ وہ اپنی سرگرمیاں اندرون ملک ہی تک محدود رکھیں تو زیادہ اچھا ہے۔ بیرونی ممالک میں ہماری اسلامی حکومت کی خواتین جس پہلو سے متعارف ہو رہی ہیں اسکو واضح کرنے کے لئے ہم یہاں اس قدر کی کارگزاری پیش کرتے ہیں جو آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی طرف سے امریکہ میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی

زنانہ نمائش میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو سکیگا کہ جہاں ہر مذہب و ملت کی خواتین نے اپنی اپنی تہذیب و روایات کی نمائش کی وہاں ایک خالص اسلامی حکومت کی نمائندہ خواتین نے اسلامی تہذیب و روایات کے کیا نمونے دکھائے۔

"بین الاقوامی زنانہ نمائش کا چھبیسواں سالانہ اجلاس جو ۷ نومبر ۱۹۴۹ء کو نیویارک میں شروع ہوا اس میں پاکستان کی نمائندگی بیگم حسین ملک (قائدِ وفد) بیگم نذیر احمد اور مسز پراڈ نے کی۔۔۔۔۔۔ شام کو پاکستانی وفد (بیگمات مذکورہ) نے حاضرین کی تواضع کے لئے ایک دلچسپ پروگرام پیش کیا۔۔۔۔۔۔ بیگم حسین ملک نے جنہوں نے اس پروگرام کا افتتاح کیا پاکستانی عورتوں کی طرف سے امریکن عورتوں کو خیرسگالی کا پیغام پہنچایا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ پاکستانی عورتوں کو تعمیر ملک کے کاموں میں عملاً شریک کرنے کے لئے ان کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جاتی ہے ۔۔۔۔ پردہ کے نفاذ سے عورتوں کو ان کے سیاسی اور شہری حقوق سے محروم کرنا مقصود نہیں تھا۔[1] بہرحال اب پردہ پاکستان سے بڑی تیزی سے رخصت ہو رہا ہے۔ بیگم حسین ملک کے بعد بیگم نذیر احمد نے حاضرین کو پاکستانی گیت سے محظوظ کیا۔ پروگرام کے آخر میں مشہور عالم رقاصہ زہرہ اور اس کے ساتھی نے مغلوں کا درباری رقص پیش کیا۔[2]

اس پروگرام میں ہمارے سفارت خانہ کے افسروں، ان کے متعلقین، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں شریک ہونے والے پاکستانی وفد کے ارکین اور امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کی ایک کثیر تعداد شریک تھی۔"

(۲۳ اور ۲۵ نومبر ۱۹۴۹ء۔ ڈان۔ کراچی)

پاکستانی خواتین کی ترقی پر نیویارک کے کرسچین سائنس مانیٹر" Christian Science Monitor میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جو ڈان کراچی نے اپنی ۲۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں نقل کیا ہے۔ ہم اس کا ضروری

---

[1] بیگم صاحبہ نے یہ 'باورچی' (معذرت) غالباً اسلام کی طرف سے پیش کی ہے جس کے لئے وہ مسلمانوں کی طرف سے شکریہ کی مستحق ہیں۔

[2] انصاف سے فرمائیے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان نہ قائم ہوا ہوتا تو اس عظیم الشان اسلامی ثقافت کا مظاہرہ کون کرتا اور امریکہ جیسے دور دراز کفرستان میں آج اس کا مظاہرہ کر کے اسلام کا بول بالا کون کرتا!!

تفصیلات یہاں پیش کرتے ہیں۔ اس سے بھی اندازہ ہو سکیگا کہ باہر کی دنیا میں پاکستانی خواتین کے حال اور مستقبل کو کس نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے اور کن عنوانوں سے پیش کیا جا رہا ہے۔

"نیویارک ۲۰ دسمبر۔ پاکستانی خواتین برابر ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھ رہی ہیں...... ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یعنی پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی، آزاد قومی زندگی کی لہر حرم کے اندرونی گوشوں تک پہنچ گئی۔ بہت سی پردہ نشین عورتوں نے بھی آزادی کا مطالبہ کیا اور یک لخت ان میں سے سینکڑوں دبلے زرد ڈھانچے لئے ہوئے پناہ گزینوں کی مدد کے لئے گھروں سے باہر نکل آئیں.....

بیگم رعنا لیاقت علیخاں ——— وزیر اعظم پاکستان کی نرم و نازک، زندہ دل، حسین بیوی۔ نہایت ہوشیاری کے ساتھ پردہ کو سرے سے اڑا دینے کے خواہاں اور اس کے دقیانوسی حامی گروہوں کے بین بین راستہ اختیار کر رہی ہیں.... حال ہی میں صوبہ سرحد میں ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ پاکستانی گورنر کو خوش آمدید کہنے کے لئے سینکڑوں پٹھان عورتیں گھروں سے باہر نکل آئیں۔" (ڈان، کراچی، مورخہ ۲۹ دسمبر ۴۹ء)

"شاہ ایران کے ساتھ جو ایرانی اخبار نویس پاکستان آئے تھے انہوں نے واپس جا کر اپنے اخبارات میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے ان کا ایک نمونہ مسٹر ممتاز احمد خاں صاحب جو شاہ کے ہمراہ طہران گئے تھے، کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:-

ممتاز احمد خاں صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"..... ایرانی اخبار نویسوں نے جو شاہ ایران کے ساتھ پاکستان آئے تھے، واپس جا کر پاکستان پر

ل قرآن نے جن خواتین کو مسلمان عورتوں کی رہنمائی پر مقرر کیا ان کے اوصاف سورہ احزاب میں یہ گنائے ہیں: مسلمات (خدا کی فرمانبردار) مومنات (خدا پر ایمان رکھنے والیاں) قانتات (مطیع)، صادقات (راستباز)، صابرات (ثابت قدم)، خاشعات (خدا ترس) متصدقات (صدقہ دینے والیاں)، صائمات (روزہ رکھنے والیاں)، حافظات (اپنے ناموس کی حفاظت کرنے والیاں)، ذاکرات (اللہ کو یاد رکھنے والیاں) (احزاب: ۳۵) لیکن یہ اوصاف تو بقول نامہ نگار دقیانوسی قیادت کے ہیں۔ نئی قیادت جن محاسن سے مسلح ہو کر میدان میں آئی ہے وہ نرمی و نزاکت اور زندہ دلی و حسن ہے۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا!

ہر پہلو سے بہت ہی ہوشربا مضامین لکھے اور ان میں پاکستان کی فوج سے لے کر اسکی شاندار ساڑیوں اور غراروں تک ہر شے کا ذکر کیا۔

ہفتہ وار اخبار ترقی کے ایڈیٹر آقائے لطف اللہ صاحب نے لاہور پر ایک مضمون لکھا جس میں پاکستانی عورتوں کی دولتِ حسن کو، جو ملک کے ہر حصے سے اس خوب صورت رومانی شہر میں جمع ہو گئی تھی، بہت نمایاں کر کے بیان کیا۔ اپنے اس مضمون میں انہوں نے "حسنِ نمکین ہندی" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ایران کے قدیم شاعروں، مصنفوں اور سیاحوں نے ہندی لڑکیوں کی غزال چشمی کے جو نقشے کھینچے تھے آج کا لاہور اس کا ہو بہو نقشہ پیش کرتا ہے ......

یہ مضامین دکانوں، ہوٹلوں، بازاروں اور گھروں میں، ہر جگہ، خوب مزے لے لے کر اور شوق سے پڑھے گئے۔"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۴ اپریل ۵۰ء)

زہر آلود تحریریں اس تحریک کو جلدی سے جلدی کامیاب بنا دینے کے لئے جس قسم کا لٹریچر رات دن فراہم ہو رہا ہے اور وہ جس طرح بے روک ٹوک اخبارات و رسائل کے ذریعہ سے گھر گھر پہنچ رہا ہے افسوس ہے کہ اسکی پوری تفصیل پیش کرنا سر دست میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ تاہم چند مراسلات کے نمونے نذرِ ناظرین ہیں۔ ان سے آپ اندازہ فرما سکیں گے کہ ہماری اس اسلامی حکومت کے ارکان جو اپنی ذات پر معمولی سے معمولی تنقید بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور اگر کوئی اخبار یا رسالہ بھول کر بھی ان کی شان میں ایک حرف نکتہ چینی کی قسم کا لکھ دیتا ہے تو فوراً چراغ پا ہو جاتے ہیں اور اس "غدار" کی سیفٹی ایکٹ سے خبر لے ڈالتے ہیں، وہ کتنے روادار و فیاض و حریت نواز واقع ہوئے ہیں۔ اس قسم کی تحریروں کے لئے جو ان کے اس محبوب مقصد "آزادیٔ نسواں" کو تقویت پہنچائیں اگرچہ ان میں خاندانِ رسالت اور صحابہ و صحابیات کی کھلی ہوئی توہین کی گئی ہو، اگرچہ ان میں ہمارے تمام اسلاف صالحین کو بد اخلاق ٹھیرایا گیا ہو اور اگرچہ ان کے ایک ایک حرف سے اسلاف کے خلاف غصہ اور نفرت کی بو پھوٹ رہی ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

راولپنڈی کے کوئی بزرگ کیپٹن ظفر اللہ پوشنی ہیں۔ ان کا ایک مراسلہ جو سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کی ۲۷ اپریل ۴۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، ملاحظہ ہو:۔

"جناب مسز جہاں نے میرے خط کا جو جواب دیا ہے اس نے اس تیزی کی یاد تازہ کر دی ہے جو دورِ

قید رہنے کی وجہ سے اُس کوٹھری ہی سے محبت کرنے لگ جاتا ہے جس میں وہ بند رکھا گیا ہو۔

ہاں میں جانتا ہوں کہ پیغمبر کی بیٹی فاطمہ پردہ کرتی تھیں۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ قائدِ اعظم کی بہن فاطمہ ایسا نہیں کرتیں، اور یہی (موجودہ) فاطمہ کا طریقہ صحیح[1] ہے۔ کیونکہ ہمارا ملک دوسرا ہے، ہماری دنیا دوسری ہے، ہمارے حالات دوسرے ہیں اور یہ سب کچھ اس سے مختلف ہے جو تیرہ سو سال پہلے تھا۔[2]

یہ بالکل بے تکے پن سے ہر معاملہ میں قدیم زمانہ سے جواز تلاش کرنے کا رجحان صرف احمقانہ[3] ہی نہیں بلکہ

---

[1] یہ تقابل ملاحظہ ہو مِس فاطمہ جناح کا حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو تمام خواتینِ جنت کی سردار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ہیں اور جن کی زندگی تمام خواتینِ امت کے لئے نمونہ اور جن کی محبت لازمۂ ایمان قرار دی گئی ہے۔ پھر یہ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس تقابل میں مس فاطمہ جناح کے طریق زندگی کو اہل بیت رسالت کے اسوۂ حسنہ پر کھلم کھلا ترجیح دی گئی ہے لیکن ہماری اسلامی حکومت کے اُمرا میں سے کسی کی غیرت بھی اس پر حرکت میں نہ آئی۔ پچھلے دنوں کسی اخبار کی محض اس اطلاع پر کہ امریکہ کی کسی فلم کمپنی کی کسی فلم میں کسی نوعیت سے حضرت فاطمہ کا ذکر آگیا ہے پاکستان کے مسلمانوں کی غیرتِ ایمانی بھڑک اٹھی تھی حالانکہ وہ محض افواہ ہی افواہ تھی اور یہاں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک شخص سیدۂ پاک کی کھلی ہوئی توہین و تحقیر کر رہا ہے لیکن کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ ہمارے بعض بزرگ مسلمانوں کی اس ادا پر بھی قربان ہونے ہیں کہ وہ خود اپنے بزرگوں اور ائمہ دین کی چاہے جتنی توہین کر ڈالیں لیکن کوئی دوسرا ان کے خلاف زبان کھولے تو اسکی جان ایک کرکے رہیں۔

[2] جب سب کچھ دوسرا ہے تو صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہمارا دین بھی دوسرا ہے۔ اسلام کا انکار کرکے تم جس وادی میں چاہو بھٹکو اور جس کو چاہو اپنا امام اور ہادی بناؤ کسی مسلمان کو تم سے بحث نہیں ہوگی۔ لیکن مسلمان کہلا کے تمہیں ان کی توہین کرنے کا کیا حق ہے جن کی پیروی امت کے لئے خدا نے ایمان اور ذریعۂ نجات قرار دی گئی ہے؟

[3] آپ کچھ سمجھے کہ یہ ذات شریف کس بات کو احمقانہ قرار دے رہے ہیں؟ اس بات کو کہ مسلمان ہر معاملہ میں رسول اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقہ سے سند ڈھونڈنے کی کوشش کریں، ہر امر میں خلافتِ راشدہ اور سلفِ صالحین کے تعامل کی دلیل تلاش کریں! ہر قدم اٹھاتے وقت اس بات کی جستجو کریں کہ پیغمبر اور صحابہ کی زندگی کی روشنی میں یہ قدم اٹھانا صحیح ہے یا غلط؟ یہ رجحان ان حضرت کے نزدیک احمقانہ ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ مراسلہ اس اخبار میں شائع ہوا ہے جو ۱۹۴۹ء کے وسط میں سیفٹی ایکٹ کے تحت تین مہینے کے لئے اس جرم میں بند کیا گیا کہ اس نے کشمیر کے متعلق ایک ایسی افواہ چھاپ دی تھی جس سے ہمارے وزیر اعظم صاحب کے متعلق عوام میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن اسی اخبار نے جب مسلمانوں کے اتباعِ صحابہ و رسول کے قول کو احمقانہ اور خطرناک قرار دیا تو کسی کو اس کی قدر[4]

خطرناک بھی ہے۔ اس کا نتیجہ سماجی جمود اور ذہنی پستی ہوگا۔

بہن جبین: سنو! آپ کی جو بہنیں قید سے رہائی پا چکی ہیں ان تتلیوں اور بھنوروں کی چھیڑ چھاڑ کر کے اپنے دل کو اطمینان دلانے کی کوشش نہ کرو۔ اپنے دل کے اندرونی گوشوں میں تم جانتی ہو کہ تتلیاں اڑ سکتی ہیں اور بلبلیں گا سکتی ہیں مگر تم پنجرے میں بند زرد چڑیا کی مانند رہائی یافتہ ساتھیوں پر حسرت بھری نظر سے تکتی ہوئی محض چیخ چیخ ہی کر سکتی ہو۔"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۴۹ء)

ایک صاحب "احساس" صاحب کا ایک مراسلہ ملاحظہ ہو جو مذکورہ بالا اخبار کی ۳۰ اپریل ۱۹۴۹ء کی اشاعت کی زینت ہے وہ اخبار کے ایڈیٹر کو مخاطب کر کے رقمطراز ہیں۔

"جناب من!

اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ روزانہ زندگی کے مسائل کو حقیقت پسندانہ طریق پر حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ پردہ کے معنی چہرے کو اس طرح چھپانے کے نہیں ہیں جس طرح ہمارے ہاں چھپایا جاتا ہے۔ یہ محض ایک اخلاقی طرز عمل ہے۔ ہم عورتوں پر پردہ ان لوگوں نے ٹھونسا تھا جن کی اخلاقی حالت کوئی اچھی نہیں تھی[1]۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے اخلاق کو بآسانی بلند نہیں کر سکتے اس لئے انہوں نے عورتوں کو اس ظالمانہ طریقہ سے قید کر دینے کی راہ نکال لی اور وہ سمجھے کہ (اس غرض پر قابو پانے کا) یہی ٹھیک طریقہ ہے .... اس میں شک نہیں کہ اگر ہم (عورتیں) بھی مردوں کی طرح باہر پھرنے لگیں تو شروع شروع میں ہمیں کچھ تکلیف ہوگی مگر یہ صرف عارضی شے ہوگی۔ جب ہم سب اس کے عادی ہو جائیں گے تو کوئی بھی ضرورت سے زیادہ ہماری طرف متوجہ

[1] یہ اخلاقی پستی کا الزام صاحب احساس صاحبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ بلکہ نعوذ باللہ خود اللہ میاں پر بھی عاید کر رہی ہیں کیونکہ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ پردہ سے متعلق تمام جزئیات و تفصیلات خود قرآن پاک اور حدیث شریف میں بیان ہوئی ہیں اور ہمارے ائمہ و فقہا میں سے کسی نے بھی اس "تبرج" کو جائز نہیں قرار دیا ہے جس کی حمایت میں موصوفہ یہ تقریر فرما رہی ہیں۔

نہیں ہوگا۔ ہمارے دیہات میں کوئی پردہ نہیں ہے۔ عورتیں آزادانہ پھرتی ہیں اور مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ اور وہ ٹھیک طرح سے رہتی ہیں۔

کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ شہروں میں بھی یہی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے؟ شہری لوگ تو بہرحال نسبتاً زیادہ ہی پڑھے لکھے اور زیادہ ذمہ داری کا احساس رکھنے والے ہوتے ہیں۔"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۵۲ء)

اس تحریک کو غذا اور قوت پہنچانے کے لئے اسلامی تاریخ بالخصوص صدر اول کی تاریخ کو جس رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے اس کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ پاکستان ٹائمز لاہور کے میگزین سیکشن مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ایک بزرگ اپنے ایک مضمون کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:-

"پہلا ادبی مرکز جس کا ہماری موجودہ تاریخ پتہ چلا سکی ہے اس کے قائم کرنے کا فخر حضرت سکینہ کو حاصل ہوا جو سید الشہداء حضرت امام حسینؓ کی صاحبزادی اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی تھیں۔ مدینہ میں ان کا خوبصورت محل وقت کے تمام بڑے بڑے نغمہ نگاروں، گویوں، شاعروں اور اہل علم کا مرکز تھا۔ عین اس زمانہ میں جب کہ بہادران اسلام کی تلواریں اسپین اور سندھ کو زیر نگیں کرنے میں مصروف تھیں، یہ نامور خاتون وقت کے ذہین طبقہ کے دلوں اور دماغوں پر حکمرانی کر رہی تھیں۔ یہ ایام اسلامی فتوحات کے ایام بہار تھے۔ ایک طرف ملک کے بعد ملک فتح ہو رہے تھے دوسری طرف اجتماعی اور تہذیبی دائروں کے اندر بھی فتح کے بعد فتح حاصل ہو رہی تھی۔"

لے یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح نظروں کے سامنے اول روز کپڑے اتار دینے میں بڑی شرم محسوس ہوتی ہے مگر کچھ مدت کے بعد کسی مرد و عورت کو یہ احساس تک نہیں رہتا کہ برہنگی کوئی شرمناک چیز ہے۔ ۲ے صاحب موصوف اور ان کے ہم مشرب لوگوں کو شاید معلوم نہیں ہے کہ اگر چلئے دیہات میں کوئی دن آزاد منش خواتین کے سے بناؤ سنگھار کر کے ان کی سی چال چلتی ہوئی باہر پھریں اور مردوں کے ساتھ ان کی طرح خلا ملا رکھیں تو شاید اس گاؤں کے غیرت مند لوگ زندہ ہی نہ رہنے دیں۔

حضرت سکینہ فیشن میں ہماری سب سے بڑی اور سب سے پہلی لیڈر ہیں۔ وقت کی تمام مجلسی خواتین ان کے طرہ کی نقل کرنے کی کوشش کرتی تھیں اور اسکو طرۂ سکینہ کہا جاتا تھا۔ وہ موسیقی میں خاص دلچسپی لیتی تھیں چنانچہ انہوں نے اپنے ایک غلام شریح نامی کو اس زمانہ کے شہرہ آفاق گویے طویس سے تربیت دلائی تھی۔

اس ادبی مرکز کے جواب میں ایک دوسرا ادبی مرکز، حجاز کے مشہور صحت افزا مقام طائف میں قائم تھا۔ اس مرکز کی روح رواں عائشہ تھیں جو مشہور صحابی حضرت طلحہؓ کی صاحبزادی تھیں۔ عائشہ کی ماں حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں جن کے نام ہی پر بھانجی کا یہ نام رکھا گیا تھا۔

ان کی کھلے بندوں پبلک میں آمد و رفت حضرت سکینہ سے بھی زیادہ نمایاں اور جاذب نظر تھی۔ ایک مشہور قدیم مورخ نے لکھا ہے کہ ان کے دوسرے شوہر ابن زبیر نے جب ان کی اس بات پر اعتراض کیا کہ وہ کبھی چہرے پر نقاب نہیں ڈالتی ہیں۔ تو انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ "جب خدائے جمیل نے مجھے اپنے فضل سے حسن و جمال بخشا ہے تو میں اس کے حسن صنعت کو لوگوں کی نگاہوں سے کیوں چھپاؤں۔ لوگ اس طرح خدا کی صناعی کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۱"

(پاکستان ٹائمز میگزین سیکشن۔ مورخہ ۴ اکتوبر ۴۹ء)

یہ اہل بیت رسالت اور خاندان صدیق اکبرؓ کی بہو بیٹیوں کی تصویر کھینچی گئی ہے اور مضمون نگار صاحب نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ دعوےٰ کیا ہے کہ یہی اس زمانہ کا عام رنگ تھا، اس طرح عورتیں کھلے بندوں اپنے حسن و جمال کی نمائش کرتی پھرتی تھیں تاکہ لوگ خدا کی صنعت کاری کی نشانیاں دیکھ سکیں، جگہ جگہ صحت افزا مقاموں پر نازنینان وقت لٹریری سیلون بنا کے بیٹھتی تھیں اور بھانڈ اور گویے اور شعراء ان کے ارد گرد جمع رہتے تھے۔ وہ فیشن کے نئے نئے نمونے ایجاد کرتی تھیں اور وہ نمونے مقابلہ کے بازاروں میں آتے تھے اور ترجیح و انتخاب کے بعد

۱ یہ پوری بکواس بلا حوالہ ہے۔ حدیث یا تاریخ کی کسی کتاب کا نام اشارۃً بھی نہیں دیا گیا ہے جس سے پتہ چل سکے کہ ان روایات کا ماخذ کیا ہے اور ان کے تاریخی استناد کا کیا پایہ ہے۔ آگے ہم اس معاملہ کی اصل حقیقت واضح کریں گے۔

تمام شہر میں پھیلتے تھے اور والدگان حسن وادا ان کو قبول کرتے تھے۔

اسلامی تاریخ کا وہ دور مبارک جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر القرون سے تعبیر فرمایا ہے ان مضمون نگار صاحب کے نزدیک نسوانی ترقی کی ان تمام "نورانیتوں" سے منور تھا لیکن بعد میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کو اپنے آپ پر یا اپنی عورتوں پر اعتماد نہیں رہا اور انہوں نے عورتوں کی اس ترقی کو پیچھے دھکیل دیا۔ چنانچہ اس مضمون میں مضمون نگار صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"یہ تو بعد کے عباسیوں کے زمانہ میں جب انحطاط شروع ہوا تو عورتوں کی ترقی کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔ اس زمانہ میں بے حیائی اتنی بڑھ گئی تھی کہ جن لوگوں کو اپنے آپ پر یا اپنی عورتوں پر اعتماد باقی نہ رہا انہوں نے عورتوں کو چہار دیواری کے اندر بند کر دیا"

اس قسم کی نادر تحقیقات جو یہ حضرات فرما رہے ہیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ان کی نگاہوں میں جلال و جمال تو سمایا ہوا ہے ہالی وڈ کے ایکٹرز اور ایکٹرسوں کا، اور وہی سوسائٹی جو ہالی وڈ میں قائم ہے یہ حضرات پاکستان میں بھی قائم کرنے کے متمنی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہالی وڈ کے نام سے ہالی وڈ کی تہذیب کو یہاں مقبول بنانا ممکن نہیں ہے اس لئے انہوں نے اس پر مدینہ اور طائف کے لیبل لگانے شروع کر دیئے اور یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ہالی وڈ کی ساری تہذیب تو درحقیقت سرقہ ہے ہماری اس اسلامی تہذیب کا جو خیر القرون میں مکہ و مدینہ و طائف میں رائج تھی لیکن بعد میں عباسیوں کے دور زوال میں آ کے اس تہذیب کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔

جن پاکیزہ خاندانوں کی تحقیقات کی یہ تصویر دکھائی گئی ہے ان کی تصویر ذرا ایک نظر اس رنگ میں بھی ملاحظہ فرمایئے جس رنگ میں قرآن نے ان کو نمایاں کیا ہے۔ اس سے اچھی طرح اندازہ ہو سکیگا کہ یہ تصویر کتنی مختلف ہے اس تصویر سے جو یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اہل بیت کو مخاطب کر کے یہ تعلیم دی گئی ہے۔

وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھو اور گذرے ہوئے زمانہ جاہلیت کے طریقہ پر اپنی نمائش نہ کرتی پھرو نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرتی رہو۔ اس حکم سے اللہ یہ چاہتا ہے اے رسول کے گھر والو کہ تم سے ناپاکی کو دور کرے اور تم کو پاکیزہ بنائے جیسا کہ چاہیئے۔ اور تمہارے

گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور دانائی کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں ان کا چرچا کرو، اللہ باریک بیں اور خبر رکھنے والا ہے۔ فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں، ایمان رکھنے والے مرد اور ایمان رکھنے والی عورتیں، یکسو ہونے والے مرد اور یکسو ہونے والی عورتیں، راستباز مرد اور راستباز عورتیں، ثابت قدم مرد اور ثابت قدم عورتیں، خدا ترس مرد اور خدا ترس عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنے ناموس کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو بہت زیادہ یاد رکھنے والے مرد اور اللہ کو بہت زیادہ یاد رکھنے والی عورتیں ——

ان کے لئے اللہ نے مغفرت اور بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔ (۳۳-۳۵-احزاب)

یہ ہدایات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال کو مخاطب کر کے دی گئی تھیں اور آنحضرت صلعم کے اہل عیال میں حضرت فاطمہ زہرا اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کا جو درجہ و مرتبہ ہے اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مذکورہ ہدایات و اوصاف کا کوئی بہترین نمونہ اگر ہو سکتا تھا تو یہی خواتین ہو سکتی تھیں اور اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ ان اوصاف کا بہترین عملی نمونہ تھیں بھی۔ پھر یہ بات کس قدر بعید از قیاس ہے کہ جن پاکیزہ خواتین کی زندگیاں اس قرآنی سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھیں انہی کی پوتیاں اور بھانجیاں ایسی اٹھیں کہ انہوں نے مدینہ و طائف میں لٹریری سیلون ( ) بنا بنا کے اپنے ارد گرد گویوں اور بذلہ سنجوں کے مجمع اکھٹے کرنے شروع کر دیئے اور اپنے حسن و جمال کی نمائش کے لئے اسی تبرج جاہلیت کو اختیار کر لیا جس کی ان کی بزرگ دادیوں اور خالاؤں کو قرآن مجید میں ایسی صراحت کے ساتھ ممانعت کی گئی تھی؟

لیکن ہم تھوڑی دیر کے لئے دل پر انتہائی جبر کر کے فرض کر لیتے ہیں کہ ایسا ہوا اور حضرت سکینہ نے اپنے عظیم الشان باپ اور اپنی عظیم المرتبہ دادی اور عائشہ نے اپنے صالح باپ اور اپنے جلیل القدر نانا اور اپنی جلیل القدر خالہ کی پسندیدہ اور اسلامی روشیں ترک کر کے وہی آزادیاں اور بے قیدیاں اختیار کر لیں جن کا مضمون نگار صاحب نے ذکر فرمایا ہے مگر سوال یہ ہے کہ "زوال اور انحطاط" کا نمونہ ان میں سے کونسا طریقہ ہے۔ وہ جس کا قرآن نے فرمایا ہے اور جس پر حضرت فاطمہ زہرا اور حضرت عائشہ صدیقہ تھیں یا وہ جس کو مضمون نگار صاحب نے حضرت

سکینہ بنت حسینؓ اور عائشہ بنت طلحہؓ کی طرف منسوب کیا ہے ؟

ستم پر ستم یہ ہے کہ یہ حضرات اتنی بڑی بڑی تہمتیں ایسے پاکیزہ خاندانوں کی بہو بیٹیوں پر لگا جاتے ہیں اور یہ کچھ نہیں بتاتے کہ یہ بات وہ کس بنیاد پر کر رہے ہیں تاکہ کوئی شخص اس کی لغویت اگر واضح کرنا چاہے تو نہ کر سکے۔ شہید کربلا کی صاحبزادی، فاطمۃ الزہراؓ کی پوتی، صدیق اکبرؓ کی نواسی، اور ام المومنین عائشہ صدیقہ کی بھانجی کی حرمت ان کا مرتبہ صاحبان کی نظر میں بس اس قدر ہے کہ "ایک قدیم مورخ لکھتا ہے" کی سند پر جو خرافات چاہے ان کی شان میں بکتے جائے معلوم نہیں یہ قدیم مورخ کون ہے ؟ کس دور کا آدمی ہے ؟ اس کا دین و مذہب کیا ہے ؟ اور کن ذرائع معلومات کی بنا پر یہ باتیں روایت کر رہا ہے ؟ محض قدیم ہونا یا مورخ ہونا تو اسباب کے لئے کافی نہیں ہے کہ اس نے جو لکھدیا ہے اس پر ایمان لے آئے۔ قدیم و جدید دونوں ہی گروہوں میں ہم ایسے بہت سے مورخوں سے واقف ہیں جن کی زندگیوں کا مقصد ہی یہی تھا اور ہے کہ انبیاؑ و صحابہؓ اور ان کے پاکیزہ گھرانوں کی زندگیوں کو بگاڑ کے پیش کریں تاکہ اس طرح اپنے ان آقاؤں کی عیاشیوں اور رنگ رلیوں کیلئے شرعی دلائل فراہم کر سکیں جن کا وہ نمک کھاتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ پاکستان ٹائمز کے مضمون نگار صاحب نے اس گروہ کے کن "قدیم مورخ" کی خوشہ چینی سے تحقیقات کے یہ نوادر فراہم فرمائے ہیں ؟

حوالہ کی غیر موجودگی میں مذکورہ بالا بیانات کی تردید یا تصدیق کا معاملہ تو مشکل ہے لیکن عام ناظرین کی واقفیت کے لئے یہ بتا دینا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا کہ ہمارے یہاں ادب و تاریخ کی بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو زمانۂ انحطاط کے بگڑے ہوئے خلفاء اور امراء نے اپنے نمک خواروں سے اس لئے لکھوائی تھیں کہ ان کی تفریح طبع کا سامان مہیا ہو سکے۔ ان کتابوں میں گپوں اور قصوں، عشقیہ حکایتوں اور فسانوں، راگوں اور گیتوں کی لپیٹ میں صحابہؓ و صحابیاتؓ یا ان کے وابستگان سے متعلق ایسے واقعات بھی جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو سے ان فاسق امراء کی رنگ رلیوں کے لئے دلیل ہاتھ آئے ہمارے عربی لٹریچر میں کتاب الاغانی اس طرز کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اس میں عربی گیتوں اور راگوں، گویوں اور گانے والیوں کے ذکر کے سلسلہ میں بہت سے ایسے واقعات بھی ضمناً آگئے ہیں جن کا مقصد پڑھنے والے کے ذہن پر یہ اثر ڈالنا ہوتا ہے کہ یہ رنگینیاں کچھ اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ رسول اور صحابہ کے زمانہ میں بھی اسی طرح موجود تھیں جس طرح آج موجود ہیں۔ اس قسم کے جتنے واقعات ان کتابوں میں ملتے ہیں

بیشتر یا تو محض گپ ہیں یا ان میں صداقت کا کوئی ذرہ ہے تو اس کی نوعیت یہ ہے کہ دو مرتبہ تزویر کے تحت ذرا سی کوئی بات کسی سے سنی ہوئی ہے تو اسکو نمک مرچ لگا کر ایک پوری داستان تیار کر دی گئی ہے۔ کوئی صاحب نظر اور صاحب علم تو اس طرز کی کتابوں کو ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتا لیکن جو لوگ مکھیوں کی طبیعت رکھتے ہیں اور بیشتر گندی ہی چیزوں پر بیٹھنا پسند کرتے ہیں وہ اس قسم کی کتابوں سے بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ کتابیں جس مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں، اگر کوئی شخص اسی مقصد کے لئے ان کی طرف رجوع کرے تو ہر چند ہمارے نزدیک یہ بھی ایک بہت بری بدذوقی ہے تاہم اس کی آزادی انتخاب کا حق تسلیم کر کے ہم اس پر صبر کر لیں گے۔ لیکن یہ تو بڑا ظلم ہے کہ حدیث اور رجال اور تاریخ و سیرت کی مستند کتابوں کو چھوڑ کر اب اس طرح کی خرافات میں سے جھوٹی سچی روایتیں جمع کی جائیں اور دنیا کو یقین دلایا جائے کہ دیکھو یہ ہیں اسلامی تہذیب، اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت کے اصل نمونے۔

ؔ میں نے اس اہتمام کے ماخذ کے متعلق یہ رائے محض اپنے ذوق کی بنا پر قائم کی تھی اور چونکہ ملتان جیل میں جہاں میں نے یہ کتاب لکھی ہے اس معاملہ کی تحقیق کے لئے ضروری کتابیں میسر نہیں تھیں اس وجہ سے پورے اعتماد کے ساتھ اس کی تردید یا تصدیق میرے لئے مشکل تھی لیکن حسن اتفاق سے ایک روز جیل کی لائبریری کی فہرست الٹتے پلٹتے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی نظر ایک کتاب پر پڑ گئی جس کا نام "حضرت سکینہ بنت حسین" تھا۔ کتاب نکلوا کر دیکھی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کے مصنف مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی ہیں۔ کتاب کی نوعیت کا اندازہ تو شرر صاحب کے نام ہی سے ہو گیا تھا لیکن مزید اطمینان کے لئے کتاب پڑھی تو اس کے ماخذ کے متعلق میرا گمان صحیح نکلا۔ شرر صاحب نے اپنے مذاق کے مطابق یہ ایک ناولانہ مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے اگرچہ بیان کردہ واقعات کے حوالے نہیں دیئے ہیں اور نہ ایک ناولانہ مضمون میں اس کی ضرورت تھی لیکن بحیثیت مجموعی کتاب کے ماخذ کا پتہ دے دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اکثر و بیشتر حصہ کتاب الاغانی سے ماخوذ ہے۔

یہ کتاب ہمارے بزرگ اسلاف کی زندگی کا اشتہار دینے کے لئے لکھی گئی ہے تاکہ لوگوں کو رندی و ہوسناکی کے لئے دلیل اور سند ہاتھ آئے چنانچہ مصنف نے اپنا مقصد کتاب کے شروع میں خود ہی ظاہر کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"ہمارے قدیم مورخین چونکہ عموماً لوگوں کے ثقہ اور پارسا ہونے ہی کی قابلیت زیادہ رہتے ہیں لہذا ہم افسوس کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں....." مصنف کے مذاق اور رجحان کا اندازہ اس کے مندرجہ ذیل الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسے خلیفہ راشد کے متعلق لکھے ہیں:

"عمر بن عبدالعزیز کہ جو تمام خلفائے اسلام میں ملاؤں اور خشک مزاج زاہدوں کی شان رکھتا تھا اسکے دادا حضرت سکینہ کے جوتے کی علم تقلید کو بارہ رکھنے کے لئے اپنی شاہی قوت سے کام لینا پڑا وہ ہاتھ میں دُرّہ لیے پھرتا اور جس کے سر پر طرۂ سکینہ دیکھتا دُرّے لگاتا"

شرر صاحب نے کتاب الاغانی وغیرہ جیسی کتابوں سے اخذ کر کے اس قسم کے بہت سے نقشے اپنے ناولوں کے ذریعے سے مسلمانوں میں پھیلا دیئے ہیں اور اب ہمارے نئے محققین [illegible]

یہ حرکت بالکل اسی طرح کی ہے جیسے کوئی شخص اسرائیلی خرافات میں سے وہ سارا مواد جمع کرے جس میں خدا کے پیغمبروں پر جھوٹ، زنا، چوری، شراب خوری اور طرح طرح کی بداخلاقیوں کی تہمتیں لگائی گئی ہیں اور پھر کہے کہ دیکھو، یہ ہیں وہ اصل کام جن کے لئے خدا نے اپنے پیغمبر دنیا میں بھیجے تھے۔

آغاخاں کی رہنمائی یہ سطریں لکھ ہی رہا تھا کہ ڈان میں مسلمانوں کے قدیم ناصح مشفق جناب سر آغاخاں بالقابہ کی وہ تقریر نظر سے گذری جو انہوں نے ۸ فروری ۵۰ء کو مسٹر زاہد حسین گورنر اسٹیٹ بینک کے مکان پر بین الاقوامی امور سے متعلق ادارہ کے اہتمام میں کراچی کے اونچے طبقہ کے ایک اجتماع کو مخاطب کر کے مرشدانہ انداز میں فرمائی ہے۔ تقریر کا موضوع تھا "مسلمان سلطنتوں کا عروج و زوال اور ان کا مستقبل"۔ اس تقریر میں آپ نے تاریخ کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان کے ارباب کار کو جو قیمتی مشورے دیئے ہیں ان میں سب سے زیادہ زرین مشورہ، خود ان کے الفاظ میں، یہ ہے۔

"یقین کیجئے کہ حقیقی اسلام کبھی بھی جامد نہیں تھا۔ یہ ہمیشہ ایک متحرک شے رہا ہے۔ بنو امیہ کے عظیم الشان دور میں جبکہ اسکی بنیادیں گہرائی اور وسعت کے ساتھ رکھی گئیں، یہ متحرک، نہایت سادہ اور واضح تھا ..... اپنے مورخوں اور مفکروں کو ہدایات کیجئے کہ وہ اپنی ساری توجہ بنو امیہ کے اس عظیم الشان صد سالہ دور پر مرتکز کریں، اور آپ اس اموی دور کو نمونہ کے طور پر سامنے رکھیئے"

آگے چل کر اس مثالی دور کے فضائل و محاسن کی تفصیل کرتے ہوئے آپ نے اسلامی تہذیب و معاشرت کے انہی دو نمونوں کا ذکر فرمایا ہے جن کا ذکر پاکستان ٹائمز کے مضمون نگار صاحب کے حوالہ سے اوپر گذر چکا ہے۔ آپ نے فرمایا:

"اس سلسلہ میں دو مثالیں بالکل واضح طور پر پیش کی جا سکتی ہیں حضرت امام حسین کی صاحبزادی سکینہ اور طلحہ کی صاحبزادی (حضرت ابوبکر صدیق کی نواسی) نے عرب کی زندگی میں معاشرتی اور علمی حیثیت سے جو آزادانہ حصہ لیا اس کا موازنہ انیسویں صدی کی خواتین کے مرتبہ سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ نیز ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ابتدائی اموی خلفاء کے زمانہ ہی میں مکہ اور مدینہ میں گانے بجانے کا معیار کس قدر بلند ہو چکا تھا اب اس کے مقابلہ میں ذرا اس نفرت و حقارت کو دیکھیئے جو اس زمانہ کے بعض گمراہ مسلمان فنون لطیفہ (گانے بجانے) سے رکھتے ہیں" (ڈان کراچی مورخہ ۹ فروری ۵۰ء)

اس تقریر کو پڑھ کر آغا خان بالقابہ کی مرشدانہ قابلیت کی داد دینی پڑتی ہے کہ اسلام کا دم بھرتے ہوئے اسلام سے فرار کی جو راہ انہوں نے سجھائی ہے وہ اب تک یہاں کے نکتہ وروں کو نہیں سوجھی تھی۔ ہمارے اربابِ کار ہاتھ پاؤں مار رہے تھے کہ کوئی ایسی راہ ڈھونڈھ نکالیں کہ اسلام کے ساتھ ناتہ بھی نہ ٹوٹے اور یہ اسلام ان کے پیشِ نظر مقاصد میں مخل انداز بھی نہ ہو سکے۔ لیکن ایسی راہ ڈھونڈھ نکالنا جو کفر و اسلام، شیطان و رحمان، یزدان اور اہرمن دونوں کو جمع کر سکے ہر مدعی کا کام نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک مرشدِ کامل کی ضرورت تھی اور اس تقریر کو پڑھنے کے بعد ہر شخص تسلیم کرے گا کہ یہ مرشدِ کامل اگر کوئی ہو سکتا تھا تو بس ہمارے آغا خان بہادر بالقابہ ہی ہو سکتے تھے جو اسلام اور اسلام کی تاریخ پر اتنی عمیق نگاہ رکھتے ہیں۔

سر آغا خان بالقابہ نے ہمارے اربابِ کار کو جو راہ سوجھائی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اسلام کے نعرہ کے ساتھ کفر قائم کرنا چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے کہ اپنے مورخوں اور مفکروں کو اس کام پر لگاؤ کہ وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور کو چھوڑ کر بنی امیہ کے دور کو اسلامی تاریخ کا خیر القرون ثابت کرنے پر اپنی تمام مساعی مرکوز کر دیں۔ کیونکہ یہی وہ دورِ میمون ہے جس میں اسلام کی "بنیادیں گہرائی اور وسعت کے ساتھ رکھی گئیں" جس میں سکینہ اور عائشہ جیسی فیشن ایبل خواتین جو بیسویں صدی کی خواتین کے لئے بھی قابلِ رشک ہو سکتی ہیں پیدا ہوئیں جس میں گانے بجانے کا وہ فنِ شریف اپنے عروج و کمال کو پہنچا جس کو اس زمانہ کے گمراہ مسلمان نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اگر ہمارے اربابِ حل وعقد سر آغا خان کے اس زریں مشورہ کو قبول کر لیں تو قرار دادِ مقاصد پاس کر دینے کے بعد سے وہ جس الجھن میں پھنس گئے ہیں اس سے بیک جنبش وہ رہائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس "دورِ مبارک" میں جس میں آغا خان کے حسبِ ارشاد "اسلام کی بنیادیں پوری وسعت و گہرائی کے ساتھ رکھی گئیں"، صرف سکینہ اور عائشہ کے قابلِ اتباع نمونے اور رقص و سرود کے ہنگامے ہی موجود نہیں بلکہ اس کی گہرائیوں اور وسعتوں میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ہمارے اربابِ کار کو تلاش ہے اور وہ مل نہیں رہا ہے اور اگر مل رہا ہے تو اسلام کے لیبل کے ساتھ نہیں مل رہا ہے۔

اس کے لئے بس ایک کام، جیسا کہ سر آغا خان صاحب نے مشورہ دیا ہے، کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اسلامی ریسرچ کے پورے ڈیپارٹمنٹ کو کچھ مزید تاکید کے ساتھ اس کام پر مامور کر دیجئے کہ وہ اس دور کی گہرائیوں میں اچھی

طرح اتر کر جو گوہر مقصود ہاتھ آئیں ان کو اکٹھا کر لیں۔ اگر ہم ماہیوں کی معلومات بھی اس کارِ عظیم میں کچھ مفید ہو سکیں تو اس دور کی بابت جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ بھی اشارات کی صورت میں یہاں نوٹ کئے دیتے ہیں بحث پر تلاش مقصود میں کچھ رہنمائی کر سکیں۔

اس دور کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ملک عضوض" اور "جبریت" کے دور سے تعبیر فرمایا ہے۔ اگر ہمارے ارباب اقتدار اپنی مطلق العنانی اور اپنے استبداد کے استحکام کے خواہاں ہوں تو یہ دورِ جبریت اس کے لئے نہایت گہری بنیادیں مہیا کر سکتا ہے۔ اس دور میں اسلام کے جمہوری و شورائی نظام ...... کو بھی ملوکیت اور ولی عہدی سے بدل ڈالا گیا۔ اگر ہمارے اربابِ کار تجارت و تاراج کے قیام کے ارمان رکھتے ہوں تو اس دور سے بڑھ کر ہماری تاریخ کا کوئی دور بھی اس ارمان کی حوصلہ افزائی کرنے والا نہیں ہے۔ اس دور نے خلفائے راشدین کے خدمت خلق اور محنت بے مزد کے طریقہ کو قیصریت و کسرویت سے بدلا۔ اگر ہمارے حکمران قیصریت و کسرویت کے احیاء کے متمنی ہیں تو صرف یہی دور ہے جو ان کے لئے مثال کا کام دے سکتا ہے۔ اس دور میں مروانی امراء کی عیاشیاں اور سفاکیاں ظہور میں آئیں۔ اگر ہمارے ارباب کار ان کے راستوں پر چلنا چاہتے ہیں تو بلاشبہ ان چیزوں کے لئے تاریخ کا قابل فخر دور یہی ہے اس دور نے یزید اور اس کے ان شقی امراء کو جنم دیا جنہوں نے حسین اور آل رسول کو کربلا میں اس جرم میں قتل کیا کہ وہ ان کی بادشاہی کے آگے خدا کی بادشاہی کا علم بلند کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہمارے ارباب حل و عقد اپنی تاریخ کو بھی کربلا کی ٹریجڈی سے نورانی کرنا چاہتے ہوں تو اس کے لئے بلاشبہ اسی دور سے رہنمائی مل سکے گی۔ اسی دور میں حجاج بن یوسف ثقفی، اور خالد قسری اور ابن ہبیرہ جیسے درندے پیدا ہوئے جن کی سفاکیوں سے خدا کی زمین چیخ اٹھی۔ اگر ان کے کارناموں کو پھر زندہ کرنا پیش نظر ہو تو لازماً اسی دور کی گہرائیوں اور وسعتوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ اس دور کے بعض مصنفین نے اپنے زمانہ کے امراء سے خطاب کر کے کہا تھا کہ خدا نے تم کو اپنی مخلوق کا چرواہا بنایا تھا مگر تم نے بھیڑیئے بن کر ان کی کھالیں ادھیڑ ڈالیں، ان کے گوشت کھا لئے اور ان کی ہڈیوں کے ڈھانچے چھوڑ دیئے۔ اگر ہمارے خداوندانِ نعمت بھی یہی چاہتے ہوں کہ گڈریے کے بجائے بھیڑیئے بن کر ہماری کھالیں کھینچیں اور ہمارے گوشت نوچیں تو بلاشبہ اس سیرت کی بہترین مثالیں بنو امیہ کے اسی صد سالہ دور میں مل سکیں گی۔ نیز یہی وہ دور ہے جس نے آغا خاں کے بقول فاطمہ زہرا کی جگہ سکینہ اور عائشہ

صدیقہ کی جگہ عائشہ بنت طلحہ کو جنم دیا، جن کی آزادی، جن کے فیشن اور جن کی مجلس آرائیوں کو آغاخاں بیسویں صدی کی خواتین کے لئے قابل رشک قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ بات ہے تو عورتوں کی اصلاح کی جو تحریک ہمارے لیڈروں نے چلائی ہے اسکی تقویت وتائید کے لئے بھی بہترین دینی مواد اسی دور کی تاریخ سے مل سکیگا۔

غرض سر آغاخاں بہادر نے اپنے اس ایک اشارہ سے ہمارے ارباب اقتدار کی وہ ساری الجھنیں دور کردی ہیں جن میں وہ قرار دادِ مقاصد پاس کرکے مبتلا ہو گئے تھے۔ اب اگر ہمارے مؤرخوں اور مفکروں نے سر جوڑ کے اس عہد سالہ دور کے مطالعہ پر محنت کی اور اسکی گہرائیوں میں اتر کر اس دور کے سارے مآثر بے نقاب کرلئے تو پھر آپ دیکھیں گے کہ تجدید و اصلاح کا وہ عظیم الشان کام جو ہماری قیادت علیا کے پیش نظر ہے اس کے لئے کوئی چیز امریکہ و انگلستان سے برآمد نہیں کرنی پڑیگی بلکہ پورا اسلامی تعمیری اور سارا مسالہ اپنے ہی گھر سے فراہم ہو جائیگا جس کو کوئی شخص بھی پردیسی یا غیر اسلامی کہنے کی جرأت نہ کر سکیگا۔

سر آغاخاں کی یہ تقریر پاکستان کے اونچے حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔ یہاں تک کہ ڈان نے اس پر داد دی ہے کہ اقبال کے بعد آغاخاں کے سوا یہ حکیمانہ باتیں اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔

دھمکیاں

سر آغاخاں کی یہ تقریر جیسی کچھ بھی ہے اس کا ایک پہلو کم از کم یہ قابل تعریف ہے کہ وہ ماضی کے ساتھ ہمارے ربط کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اگرچہ وہ ماضی عہد رسالت اور دور خلفائے راشدین کے بجائے دور بنی امیہ ہی ہو۔ لیکن یہاں تو اب علی الاعلان یہ بھی کہا جانے لگا ہے کہ ہم اب تک جس انداز سے اور جن زاویہ ہائے نگاہ سے اپنی زندگی کے معاملات پر غور کرتے رہے ہیں اب آزادی کے حصول کے بعد ان میں تبدیلی کرنی پڑیگی اور اگر طوعاً یہ تبدیلی نہ کی گئی تو مصطفےٰ کمال کی طرح جبراً یہ تبدیلی کرائی جائیگی۔ اور ساتھ ہی تمام اسلامی اقدار کی کھلم کھلا توہین کرتے ہوئے عورتوں کو سوسائٹی کے خلاف بغاوت پر ابھارا جا رہا ہے۔ لاہور کے ایک روزنامہ کے ادارتی مقالہ کی مندرجہ ذیل سطریں ملاحظہ ہوں:-

"عورتوں کی آزادی یا پردہ ونقاب پوشی کے سوال پر فرنگی اقتدار کے دور میں ہم جس انداز سے اور جن زاویہ ہائے نگاہ سے بحث کرتے رہے ہیں اب اس میں بنیادی تبدیلی کرنے کی ضرورت ہے

ورنہ ہماری معاشرت میں وہ توازن و ہم آہنگی اور وہ تناسب یک رنگی پیدا نہ ہوسکے گی جس کے بغیر قوموں کی سربلندی محال ہے۔" (احسان لاہور مؤرخہ ۳ فروری ۵۰ء)

پردہ کا مسئلہ جب بھی زیر بحث آیا ہے، خواہ فرنگی اقتدار کے دور میں یا اس اسلامی اقتدار کے عہد میں اس بحث میں کم از کم پردہ کے حامیوں کا نقطۂ نظر اور زاویہ نگاہ اسلام کے سوا کچھ اور نہیں رہا ہے۔ اب اگر قومی سربلندی اور معاشرت میں توازن و ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ اس نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے تو دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ اب زندگی کے مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور کرنے کے بجائے صرف قومی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے اور اسلام کو خیرباد کہہ دیا جائے۔

اسی سلسلہ میں آگے چل کر اڈیٹر صاحب دھمکی دیتے ہیں کہ لوگوں کو چاہئے کہ پردے سے وقت کے تقاضوں کے آگے سر تسلیم خم کریں اور معاشرت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے عورتوں کو آزادی دیں ورنہ یہاں بھی مصطفیٰ کمال کا طریقہ اختیار کر کے صبح و شام میں عورتوں کو پردہ سے باہر نکال لیا جائے گا کیونکہ معاشرت میں انتشار باقی رکھ کے دشمن کو فائدہ اٹھانے کا موقعہ بہرحال نہیں دیا جاسکتا۔ ارشاد ہوتا ہے:-

"آزادی کے حصول کے بعد معاشرت کے مختلف دائروں میں ہم آہنگی و یکجہتی پیدا کرکے قوم و ملت کی عمارت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کا کام دو ہی طرح ہوسکتا ہے:- یا تو مصطفیٰ کمال کی قسم کا کوئی آمر مطلق پیدا ہو جو کشیدگیٔ تیغ کر اس قسم کے احکام نافذ کرے کہ فلاں تاریخ اور فلاں وقت کے بعد سے کوئی عورت پردہ کے اندر نہ رہ سکے گی اور زندگی کے میدان میں مردوں کے سر کا بوجھ بنے رہنے کے بجائے اپنی راہ آپ تلاش کرے گی۔ اور یا پھر عوام میں خود اتنا شعور ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے قومی و ملی مفاد کو سوچیں اور شخصی تعصبات کو ملی مفادات کے ساتھ متصادم نہ ہونے دیں ـــــ پاکستان میں ابھی تک اس دوسری شکل کا دروازہ کھلا ہوا ہے لیکن اگر اس طرف توجہ نہ کی گئی تو پھر لازماً وہی نتیجے برآمد ہوں گے یا تو ہم میں کوئی آمر مطلق پیدا ہو جائے یا ہمارے اس اندرونی اختلال و انتشار سے اغیار ناجائز فائدہ اٹھائیں۔"

(احسان)

اس آمرانہ دھمکی کے بعد اڈیٹر صاحب سوسائٹی کے موجودہ معروف و منکر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور تلقین فرماتے

ہیں کہ جب تک معروف ومنکر کے یہ معیارات قائم رہیں گے اس وقت تک ترقی کے راستہ پر قدم بڑھانا ممکن نہیں ہے بلکہ جو خواتین اس راہ میں آگے بڑھ گئی ہیں وہ بھی نکو بن کے رہ جائیں گی اس وجہ سے سب سے مقدم کام یہ ہے کہ خیر وشر کے موجودہ اقدار وپیمانے بدلیں یہاں تک کہ جن باتوں کو آج عورت کے لئے ہنر سمجھا جاتا ہے وہ عیب خیال کی جانے لگیں اور جن چیزوں کو عیب سمجھا جاتا ہے وہ ہنر سمجھی جانے لگیں فرماتے ہیں:۔

"اصلی سوال یہ ہے کہ آیا ہم اس قسم کے مشاغل (زرنگ کی طرف اشارہ ہے) کو مسلم خواتین کے لئے باعث عزت سمجھتے ہیں یا مجبوری سبب بے شرمی کا حیلہ قرار دیتے ہیں۔ پھر سوال صرف رنگ ہی کا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اسی قسم کے دوسرے بیسیوں مسائل بھی الجھے ہوئے ہیں۔ اب تک ہماری عورتوں کو صرف مردوں کا دست نگر ہونا سکھایا جاتا ہے۔ ان سے صرف یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ شادی سے پہلے باپ بھائی کی، اور شادی کے بعد شوہر کی خدمت گذاری واطاعت شعاری کا ہنر سیکھیں۔ گھر کے مرد جو کچھ پیدا کریں اسی پر تنگی ترشی کے ساتھ اپنا وقت گذاریں اور قومی زندگی کو خوش گوار بنانے میں اپنا دائرہ عمل صرف زچہ خانے اور باورچی خانے تک محدود رکھیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا زندگی کا یہ نظریہ اب بھی ہمارے لئے سود مند ہے یا نہیں؟ کیا خواتین کو قومی وملی مشاغل کے وسیع تر میدانوں سے علیحدہ رکھنے اور انہیں صرف مردوں کی خدمت گذاری یا تفریح طبع کا آلۂ کار بنائے رکھنے کا یہ طریقہ نفع بخش ہے یا خطرناک؟

اس وقت تک تو ہماری معاشرت کا ڈھانچہ یہ ہے .... کہ اگر کوئی (عورت) بغاوت کر کے اپنا راستہ بنالے تو اسے یا تو مجبوری کی بنا پر معاف کر دیا جاتا ہے مگر حقارت کے ساتھ، یا اس کی اس حرکت کو شرمناک قرار دے کر اس کے خلاف نت نئے شگوفے چھوڑے جاتے ہیں۔ ہم نے عصمت و عفت کو صرف عورت کے ساتھ مخصوص کر کے عصمت و عفت کی حفاظت وصیانت کی راہ بھی خود ہی تجویز کر رکھی ہے۔"

اپنی اس حالت پر ماتم کرنے کے بعد ایڈیٹر صاحب نے زندہ قوموں کا اسوۂ حسنہ اختیار کرنے کی تلقین فرماتے ہیں اور عورتوں کو مخاطب کر کے للکارتے ہیں کہ تم خود اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرو اور خود اعتمادی سے عزائم کے ساتھ معاشرت کے موجودہ ڈھانچہ کو توڑ پھوڑ دو اور اگر کچھ یہ خود غلط لوگ اس پر طعن کرتے ہیں تو اس کی پروا نہ کرو۔ بھلا یہ بھی زندگی کا کوئی

مطمح نظر ہو کہ شادی کے لئے ایک شوہر تلاش کر لیا اور اسی شوہر کی خدمت گذاری میں زندگی گذار دی۔ اپنی خودی اور خودداری کو ابھارو اور زندگی کے وسیع میدانوں میں جولانیاں دکھاؤ۔ اس سوسائٹی کی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو اب تک یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ وقت کے نئے تقاضوں کے ساتھ گذرے ہوئے ماضی کا جوڑ لگانا ممکن نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ نہ صرف نرسنگ میں بلکہ ان تمام قومی و ملی مشاغل کے میدانوں میں خواتین کو آگے آنا چاہئے جن میں ان کی خدمت قوم و ملک کے وسیع تر مفاد کے لئے سود مند ہو سکتی ہے۔ ہماری خواتین کو چاہئے کہ اگر ضرورت ہو تو اس سلسلہ میں تھوڑی سی جرأت اخلاق کا مظاہرہ کرنے سے بھی نہ ہچکچائیں ......

ہماری خواتین کو محسوس کرنا چاہئے کہ بیچ کی چند صدیوں نے ہماری معاشرت کا جو ڈھانچہ بنا دیا ہے وہ ہرگز ایسا نہیں ہے کہ اس کی ہر ہر گلی اور اس کے ہر ہر کوچے کو مقدس سمجھ کر آنکھیں بند کئے اس پر چلتی رہیں۔ اگر کچھ بد خود غلط ملّے ان کو مطعون کرتے ہیں تو اس کی پروا نہ کریں صرف اپنے ضمیر اور اپنے خدا[1] کے آگے خود کو جواب دہ سمجھیں۔ اور تعمیر پاکستان کی ان منزلوں میں قدم بڑھانے سے محض اس لئے نہ ہچکچائیں کہ وہ دنیا کیا کہیگی جو دنیا ابھی تک ماضی و مستقبل کے درمیان حد فاصل کھینچنے ہی میں مجرمانہ تغافل سے کام لے رہی ہے۔ شادی کے لئے ایک شوہر تلاش کر لینا اور زندگی کو اسی شوہر کی خدمت گذاری کے سانچہ میں ڈھالتے رہنے کی کوشش کرنا کوئی مطمح نظر نہیں، کوئی مقصد نہیں۔ اصل مقصد اور اصل مطمح نظر یہ ہونا چاہئے کہ تعمیر ملت کے وسیع تر مفاد کے لئے خود کو سازگار بنائیں اور اپنی خودی اور خودداری کو دبانے کے بجائے اسے ابھاریں اور جلا بخشیں"

(روزنامہ احسان مورخہ ۴ فروری ۱۹۵۰ء)

یہ ایڈیٹر صاحب اخباری رقابت کے تحت کمیونسٹوں پر اکثر نہایت تیز و تند تنقیدیں کرتے رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں اگر ضرورت پیش آتی ہے تو مذہب کو بھی اپنی حمایت میں استعمال فرماتے ہیں لیکن مذکورہ بالا سطور پر غور سے

[1] خدا کا نام لینے کی یہ لوانی لبّا ایڈیٹر صاحب نے اپنے خداوندان کرچی سے سیکھی ہے سو بھی خدا اور اس کے دین کی خوب مرمت کر لینے کے بعد اسی طرح خدا کا حوالہ دیا کرتے ہیں۔

ملاحظہ فرما کر فیصلہ کیجئے کہ کیا کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی تصور کر سکتا ہے کہ ان کا لکھنے والا اسلام سے دور پرے کا بھی کوئی رشتہ رکھتا ہے۔ کیا لینن اور اسٹالین کا کوئی کٹر سے کٹر مرید بھی اسلام اور اسلامی روایات پر اس سے زیادہ بے باکانہ حملہ کر سکتا ہے :-

اسلام پر پیدا ہونے اور اسلامیت کے دعوے کے باوجود ان کے اخلاقی و معاشرتی نظریات بعینہٖ وہی ہیں جو دنیا کی دوسری مادیت پرست اور کافر قوموں کے ہیں چنانچہ انہی صاحب کے ایک اور اداریہ کی مندرجہ ذیل سطریں ملاحظہ ہوں :-

"خدا نے تو انسان کو بالکل آزاد بنا کر پیدا کیا ہے مگر انسان نے اپنے معاشرتی مفاد کی خاطر خود ہی اپنے اوپر مختلف قسم کی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ قدرت کا قانون تو یہ ہے کہ ہر عورت ہر مرد کے لئے کھلی ہوئی ہے لیکن ہم نے معاشرت میں نفاست و حسن پیدا کرنے اور انسانی نسل کو اخلاقی بلندیوں کی بلند سطح پر لانے کے لئے جنگل کے جانوروں کی اتباع میں جنسی جذبات کو کھلی چھٹی نہیں دے رکھی ہے۔ اس کے برعکس ہم نے ازدواج و مناکحت کی پابندیاں عاید کر کے خود اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ ہم کسی انسان کی آزادی پر بھی گرفت کرتے ہیں کہ عصمت فروشی میں بے باکی سے کام لے حالانکہ یہ اس کی آزادی میں مداخلت ہے"۔ (احسان لاہور مورخہ ۲۸ جنوری ۵۰ ء)

ان کوششوں کا مجموعی اثر | بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ کہنا یہ تھا کہ اس طرح کا فاسد اور زہریلا لٹریچر ہے جو اس تحریک آزادی نسواں کی حمایت کے لئے اس ملک کا پورا انگریزی پریس اور اردو پریس کا ایک بہت بڑا حصہ رات دن پوری سرگرمی کے ساتھ گھر گھر پھیلا رہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس تحریک کو قوم کے لیڈروں کی سرپرستی حاصل ہو جس کے اندر عمال حکومت اپنے سرکاری فرائض سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہوں، جس کی حمایت کے لئے پریس کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہو کہ جس طرح کا بھی فاسد او محرک و مہیج مواد ان کے ہاتھ لگے اسکو پھیلائیں وہ اگر جنگل کی آگ سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلے تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے چنانچہ ایک طرف تو مشہور قرار داد مقاصد ہے جو کتاب و سنت والی تہذیب قائم کرنے کے لئے پاس کی گئی ہے لیکن اس کے تقاضوں کی تکمیل میں اب تک ایک مردہ سنت بھی پورے ایک سال کے عرصہ میں زندہ نہ کی جا سکی، اور دوسری طرف اس تحریک کی گرما گرمی کا یہ عالم ہے کہ اگر تہذیب اسلامی کے

کچھ نقوش اپنی سخت جانی کی وجہ سے ہماری حیات اجتماعی کے کسی گوشہ میں دبے دباتے پڑے رہ گئے تھے تو وہ بھی صبح و شام میں مٹا چاہتے ہیں۔ اس کا صحیح صحیح اندازہ اگر آپ کو کرنا ہو تو آپ مشرقی پاکستان کے حالات کا جائزہ لیجئے۔ یہ علاقہ مغربی پاکستان کے مقابل میں نسبتاً اپنی مشرقیت اور اسلامیت کے لئے مشہور یا ہمارے تجدد پسند حضرات کے نقطۂ نظر سے اپنی رجعت پسندی کے لئے بدنام رہا ہے۔ بالخصوص عورتوں کے معاملہ میں تو اس کا حال مغربی پاکستان بالخصوص پنجاب سے بالکل ہی مختلف رہا ہے۔ لیکن ان مشترکہ مساعی کا نتیجہ یہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے آزادیٔ نسواں کی تحریک اب وہاں اس منزل میں پہنچ گئی ہے کہ مشرقی بنگال مسلم لیگ کونسل تک اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو گئی۔ چنانچہ اُس کا مندرجہ ذیل ریزولیوشن ملاحظہ ہو:-

"یہ کونسل مشرقی پاکستان کے کلبوں میں عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط اور دوسری اس قسم کی خلاف شریعت، اخلاق سوز حرکات کی پر زور مذمت کرتی ہے .... ان چیزوں کو دیکھ کر عوام کا غصہ اس قدر بھڑک رہا ہے کہ اگر حکومت نے فوراً مداخلت کر کے ان حرکات کو روک نہ دیا تو عوام خود کوئی سخت کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"[1] (ڈان - کراچی، مورخہ ۲۳ جون ۱۹۴۹ء)

قوم کی واحد نمایندہ جماعت کے اس احتجاج کے بعد جس میں یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر ان خلاف شریعت اور اخلاق سوز حرکات کی روک تھام کے لئے حکومت نے کوئی موثر قدم نہ اٹھایا تو عوام قانون اپنے ہاتھ میں لے لیں گے، یہ تحریک ہر احتجاج و اعتراض سے بالکل بے نیاز ہو کر جس طرح برابر آگے بڑھتی رہی ہے اس کا اندازہ بیگم شاہنواز کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوگا جو انہوں نے مذکورہ بالا تجویز کے پورے سات ماہ بعد ۲۰ دسمبر ۴۹ء کو مشرقی پاکستان کے دورہ سے واپس آکر کراچی میں پریس کو دیا ہے۔

"مشرقی پاکستان میں عورتوں کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ بہت سے شعبہائے زندگی میں مشرقی پاکستان کی عورتیں مغربی پاکستان کی عورتوں سے

---

[1] یہ ملحوظ رہے کہ یہ تجویز اس مسلم لیگ نے پاس کی ہے جس کے لیڈروں ہی کی حکومت ہی ان ساری حرکات کے ذمہ دار ہیں اور پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ جن "آزادانہ اختلاط" اور جن "اخلاق سوز حرکات" کو یہ حضرات بھی اخلاق سوز اور خلاف شریعت قرار دیں اس کی نوعیت کیا کچھ ہو سکتی ہے!

آگے نکل گئی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے میڈیکل کالج میں لیڈی پروفیسر اور ان چار لڑکیوں کا ذکر کیا جنہوں نے ہوائی جہاز چلانے کے لائسنس حاصل کئے ہیں۔ آپ نے کہا کہ مشرقی پاکستان کے بڑے بڑے ذمہ دار افسروں بلکہ وزراء تک کی بیویاں بھی گھروں میں بند نہیں رہتیں۔ وہ مردوں کے پہلو بہ پہلو تعمیر ملت[1] کے کاموں میں حصہ لینے کے لئے باہر نکل آئی ہیں۔"

(رسول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء)

عوام کی ذہنیتیں اس تحریک سے جس تیزی کے ساتھ متغیر ہو رہی ہیں اور ہر محفل میں عورتوں کو پیش پیش رکھنے اور ان سے رہنمائی حاصل کرنے کا مذاق جس سرعت کے ساتھ لوگوں میں ترقی کر رہا ہے اس کا اندازہ صرف اس ایک بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اب مسلمان میلاد کی مجلسیں بھی منعقد کرتے ہیں تو ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ ان میں تقریر کرنے کے لئے کسی عالم دین یا کسی مرد لیڈر کے بجائے کسی خاتون ہی کو بلائیں۔ اس وقت جب کہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرے سامنے ۹ جنوری ۱۹۵۰ء کے ڈان کا پرچہ پڑا ہوا ہے۔ اس میں حیدرآباد (سندھ) کی ایک انجمن کے جلسۂ میلاد کی روداد شائع ہوئی ہے۔ انجمن کا نام ماشاء اللہ مجلس اسوۂ رسول ہے۔ جلسہ بھی میلاد نبوی کا ہے لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس مجلسِ اسوۂ رسول نے، اسوۂ رسول بیان کرنے کے لئے جس عالم کتاب و سنت اور پیکرِ اسوۂ رسول کو دعوت دی تھی وہ مس فاطمہ جناح ہیں۔ چنانچہ اخبار نے غالباً موصوفہ کی پیروی اسوۂ رسول ہی کو نمایاں کرنے کے لئے ان کی تقریر کے ساتھ ان کی تصویر بھی شائع کی ہے تاکہ مسلمان خواتین اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ اسوۂ رسول دراصل یہ ہے جس پر ملاؤں نے پردہ ڈال دیا تھا اور جو پاکستان بننے کے بعد اب بے نقاب ہو کر سامنے آیا ہے۔ اس جلسہ میں موصوفہ نے اسوۂ رسول پر جو تقریر ارشاد فرمائی ہے وہ بھی نہایت سبق آموز ہے۔ ہمارے پاکستان میں کچھ فیشن سا ہو گیا ہے کہ جو صاحب بھی کوئی تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں وہ کلمہ "اتحاد، یقین

---

[1] تعمیر ملت ایک اصطلاح ہے جس سے مراد اسی طرح کے کارنامے ہیں جن کا ذکر اوپر مشرقی بنگال مسلم لیگ کونسل کے ریزولیوشن میں آیا ہے اور جن کے خلاف کونسل کو صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ کہیں لفظ ملت سے کوئی شخص ملت ابراہیم و محمد (علیہما الصلوٰۃ والسلام) مراد نہ لے بیٹھے۔ یہ ان لوگوں کی اپنی ملت ہے۔ ہر عربی لفظ لازماً اسلامی ہی نہیں ہوتا۔

نظم (Unity, Faith, Discipline) کی تلاوت سے اس کا آغاز فرماتے ہیں اور ظاہر کرنے کی کوشش فرماتے ہیں کہ یہی تین کلمات کن فیکون ہیں جن سے دنیا وجود میں آئی ہے اور انہی تین کلمات کے بل پر یہ پورا کارخانۂ کائنات چل رہا ہے۔ چنانچہ اسی عام روش کی تقلید کرتے ہوئے موصوف نے بھی اپنی تقریر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دنیا میں جو عظیم الشان کامیابیاں حاصل کیں وہ بھی انہی تین میں سے ایک کلمۂ یقین (Faith) کی مرہونِ احسان ہیں۔ معلوم ہوا کہ تکمیل دین تو اب کہیں جا کر بیسویں صدی میں ہوئی ہے جب کہ بقیہ دو کلمے بھی اس کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اس سے پہلے سارا کام ایک تہائی دین ہی سے چل رہا تھا۔ سبحان اللہ وبحمدہٖ۔

اس مجلس اُسوۂ رسول کے جلسہ میلاد النبی کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس میں مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی بھی تشریف فرما تھے۔ اور انہوں نے وہاں تقریر بھی فرمائی لیکن اے۔ پی۔ پی کے رپورٹر نے اپنی طویل رپورٹ میں، جو اخبار کے پورے ڈیڑھ کالموں میں شائع ہوئی ہے، ان کا ذکر صرف ڈیڑھ سطر میں اس طرح کیا ہے کہ "جلسہ میں وہ بھی موجود تھے اور انہوں نے مس فاطمہ جناح کی تقریر سے پہلے ایک تقریر فرمائی"۔ ناظرین واقف ہوں گے کہ یہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانہ بھون کے ایک مشہور عالم علوم دینی کے مدرس، اور حدیث و فقہ کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی قدر عافیت اس اسلامی مملکت میں اب یہ رہ گئی ہے کہ میلاد کی مجلسوں میں بھی بیچارے اگر بلائے جاتے ہیں تو مس فاطمہ جناح کے ایک تابع مہمل کی حیثیت سے۔ قانون سازی اور دستور سازی وغیرہ تو مولویوں کی دسترس اور ان کے مبلغ علم سے بالاتر خیال کی ہی جاتی تھیں اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمانوں کو میلاد بھی بیگمات ہی کا پسند آتا ہے، ہمارے علمائے کرام اب اس کام کے لئے بھی کچھ بہت موزوں نہیں خیال کیئے جاتے۔ اگر مسلمانوں کے ذہنی تغیر کی رفتار یہی رہی تو ہمارا اندازہ یہ ہے کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر اندر آپ دیکھیں گے کہ ہمارے یہ حضرات علما، نماز جنازہ کے لئے بھی ناموزوں قرار دے دیئے جائیں گے۔ اور اگر کسی لیڈر صاحب کی وفات ہوگی تو مسلمان یہی چاہیں گے کہ ان کی نماز جنازہ بھی شیخ الاسلام کے بجائے کوئی لیڈر صاحب یا لیڈرانی صاحبہ ہی پڑھائیں۔

گذشتہ مباحث کا خلاصہ یہ ساری تفصیل ہم نے ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے پیش کی ہے جن کو

سب کچھ دیکھنے کے باوجود بھی کچھ سوجھائی نہیں دیتا۔ اور جو ابھی تک یہی خواب دیکھے چلے جا رہے ہیں کہ ان کے لیڈر رات دن اسلامی نظام قائم کرنے کی تیاریوں میں سرگرم ہیں۔ اور اگر کوئی شخص ان کو آنکھیں کھولنے اور اصل حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے تو بجائے اس کے کہ اس کے مشورہ کو قبول کریں الٹے اس کے سر ہو جاتے ہیں کہ تم تو ہمارے لیڈروں سے بدگمان کرتے ہو۔ اس قسم کی خوش گمانی کے مریضوں کے لئے ہم نے چند نہایت کے صرف چند اخباروں سے یہ اقتباسات پیش کئے ہیں (اور واضح رہے کہ جمع شدہ مواد کا نہایت قلیل حصہ اس مضمون میں دیا جا سکا ہے) امید ہے کہ یہ مواد سرمۂ بصیرت کا کام دیگا۔ اور وہ اس کی مدد سے اصل حقیقت کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ جو سمجھ دار اور منصف مزاج آدمی بھی اس پورے سلسلہ کو غور سے پڑھے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس ملک کے ارباب اقتدار مغربی زندگی کی جو لعنت اس ملک پر مسلط کرنے کے متمنی ہیں اس کا پہلا تجربہ۔ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت وہ پہلے ہماری بہنوں اور بیٹیوں پر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں اور ان کا یہ سمجھنا ایک حد تک صحیح ہے کہ اگر عورتوں نے اس طاعون کے جراثیم قبول کر لئے تو ہماری سوسائٹی کا بقیہ حصہ اس سے بچنا بھی چاہے گا تو نہ بچ سکے گا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی شاخوں کا جال۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، پاکستان کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا ہے[1]۔ اور یہ کام سرکاری اہتمام اور سرکاری سرپرستی میں انجام پایا ہے اور انجام پا رہا ہے۔ ہر ایکسی لینسی بیگم ناظم الدین صاحب اور مس فاطمہ جناح اس ایسوسی ایشن کی سرپرست ہیں۔ بیگم لیاقت علی خان اس کی صدر ہیں۔ اضلاع میں اس کی کرتا دھرتا اعلیٰ سرکاری حکام کی بیگمات ہیں۔ اس کی کانفرنسیں گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوا کرتی ہیں۔ حکومت پاکستان نے اس ایسوسی ایشن کو باضابطہ طور پر تسلیم کر کے یہ حکم جاری کر دیا ہے کہ ان تمام معاملات میں جن کا تعلق عورتوں سے ہو محکمہ متعلقہ ایسوسی ایشن مذکور سے استصواب کرنے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائے۔

ان تیاریوں کے ساتھ یہ حضرات ہماری خواتین میں جس قسم کا انقلاب برپا کرنے کے درپے ہیں۔ اگر کوئی شخص

[1] اسی ایسوسی ایشن کی کارکن خواتین کی نگرانی و قیادت میں آئندہ نسل کی بچیوں اور نوجوان لڑکیوں کو تربیت کرنے اور پروان چڑھانے کے لئے بلیو برڈس (Blue Bird) گرل گائڈس، زنانہ رضا کار، زنانہ نیشنل گارڈ اور اینجلز آف مرسی (angels of mercy) یعنی نرسوں وغیرہ کی مختلف تنظیمیں اور تحریکیں سرگرم عمل ہیں

انہی کی تقریروں اور تحریروں کی روشنی میں اس انقلاب کے مطمح نظر کو سمجھنا اور متعین کرنا چاہے تو اسے معلوم ہوگا، کہ ہماری سیاست، معاشرت اور اخلاق کے تمام موجودہ اقدار اس کی زد میں ہیں۔ اور اگر یہ واقع ہوگیا تو ہماری زندگی کے ان تینوں گوشوں میں نہایت اہم اور بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں گی جن کا اجمالی تصور ذہن میں پیدا کرنے کے لیے ہم ان کو یہاں الگ الگ پیش کرتے ہیں۔

(۱) سیاسی پہلو سے یہ حضرات جو انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں وہ مرد و عورت کی کامل مساوات کے نظریہ پر مبنی ہے۔ حقوق میں بھی مساوات اور فرائض میں بھی مساوات۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ عورت وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو مرد کر سکتا ہے اس لئے اسے وہ سب کچھ کرنے کا موقع ملنا چاہیئے جو مرد کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ عورتوں اور مردوں کی جدوجہد کے میدان الگ الگ ہیں۔ ان کے نزدیک دونوں کے لیے ایک ہی میدان ہے اور ایک ہی گوئے و چوگان، اس سے دونوں کو زندگی کے ایک ہی میدان میں بالکل ایک ہی طرز پر بازی کھیلنی چاہیئے۔ جو شہری حقوق مردوں کو حاصل ہیں وہی شہری حقوق عورتوں کو حاصل ہیں۔ ریاست کی جو ذمہ داریاں مردوں پر عائد ہوتی ہیں، ٹھیک ٹھیک وہی ذمہ داریاں عورتوں پر عائد ہوتی ہیں جس طرح مرد شہری اور ملکی حقوق ادا کرنے کے لئے پولیس اور فوج میں بھرتی کئے جاتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی پولیس اور فوج میں بھرتی کی جائیں۔ جس طرح مرد سپاہی، پائلٹ اور کپتان اور کمانڈر بنتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی سپاہی، پائلٹ، کپتان اور کمانڈر بنیں۔ جس طرح مرد وکیل، جج، ڈپٹی کمشنر، کمشنر، سفیر اور وزیر، گورنر اور گورنر جنرل ہوتے ہیں اسی طرح عورتوں کو بھی ان تمام مناصب عالیہ پر سرفراز ہونا چاہیئے۔ جس طرح مردوں کو الیکشن لڑنے، ممبر منتخب ہونے، پارلیمنٹری سیکرٹری، وزیر اور وزیر اعظم بننے کے مواقع حاصل ہیں اسی طرح اس ساری قسمت آزمائیوں کے لئے عورتوں کو بھی مردوں کے برابر برابر مواقع ملنے چاہئیں۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ اور جدوجہد زندگی کے ہر گوشہ میں ان لوگوں کے نزدیک مرد عورت ہے اور عورت مرد۔ اس مساوات کو یہ حضرات اجتماعی زندگی میں ہم رنگی و ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے لازمی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے بغیر ملک ترقی کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا۔ اس کے بغیر ہمارے وزیر خزانہ کے ارشاد کے مطابق کوئی ملک معاشی اعتبار سے آسودہ حال نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی چیز کو مطمح نظر قرار دے کر آل پاکستان زنانہ

ایسوسی ایشن جدوجہد کر رہی ہے اور اس کے اس مطالبہ کو ہمارے وزیرِ اعظم صاحب اس ملک کی ترقی اور مدافعت کے نقطۂ نظر سے ناقابلِ انکار قرار دیتے ہیں۔

(۲) معاشرتی پہلو سے جس تبدیلی کے یہ لوگ خواہاں ہیں اور جس کے لئے مذکورہ بالا مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انہیں خواہاں ہونا چاہیئے بھی، وہ یہ ہے کہ پردہ کے احکام کو کیسر لپیٹ کر رکھ دیا جائے۔ عورت کا حسن و جمال ان لوگوں کے نزدیک چھپانے کی چیز نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ نمایاں کرکے سامنے لانے کی چیز ہے تاکہ لوگ ان کے حسن و جمال سے قدرت کی صنعت گری کے تماشے دیکھ سکیں۔ پردہ ان لوگوں کے خیال میں ایسے لوگوں کی ایجاد ہے جو خود اخلاقی اعتبار سے پست تھے، انہوں نے اپنی کمزوریوں کو مغلوب کرنے کے بجائے الٹے عورتوں کو گھروں کی چار دیواری کے اندر بند کر دیا۔ ان حضرات نے علمی و تاریخی تحقیقات سے یہ پتہ چلایا ہے کہ اسلام کے دورِ اوّل میں عورتیں آرٹ سیلون بنا بنا بیٹھتی تھیں جہاں ان کے اردگرد شعراء ادباء، بذلہ سنج، لطیفہ گو، بھانڈ اور گویّے اکٹھے ہوتے تھے اور وہ ان سب کی راہنمائی اور سرپرستی فرماتی تھیں۔ ان لوگوں کی یہ بھی تحقیق ہے کہ اس عہد کی عورتیں برقعوں اور نقابوں میں لپٹی رہنے کے بجائے اپنے حسن و جمال کے آئینہ میں لوگوں کو اللہ کی قدرت و صناعی کی نشانیوں کا مشاہدہ کراتی پھرتی تھیں۔ لیکن عباسیوں کے دورِ آخر میں جب نیتوں میں خیر القرون والی پاک بازی اور نگاہوں میں عہدِ صحابہ کی سی پارسائی باقی نہ رہی تو محتاط لوگوں کو مجبوراً آیاتِ الٰہی کی نمائش کا یہ کاروبار ختم کرنا اور اپنی عورتوں کو گھروں میں بند کرنا پڑا۔ اس گروہ کے بعض دوسرے محققین، جو اس تحقیق سے شاید مطمئن نہیں ہیں، کہتے ہیں کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ رسول اللہ کی بیٹی فاطمہؓ پردہ کرتی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قائدِ اعظمؒ کی بہن فاطمہ پردہ نہیں کرتیں اور ہمارے زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ہمارے لئے قابلِ اتباع نمونہ قائدِ اعظمؒ کی بہن ہی کا ہے نہ کہ رسولِ خدا کی بیٹی کا۔

اس حلقہ میں پردہ کے متعلق نرم سے نرم رائے ہمارے وزیرِ خزانہ آنریبل مسٹر غلام محمد کی ہے جو اس "رواج" کو ملایانہ تحکم" کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔ بہرحال استدلال کی نوعیت میں تھوڑا بہت فرق ہو تو ہو لیکن اس نتیجہ پر سب متفق ہیں کہ پردہ اس ملک کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اس کا جلد سے جلد دور ہونا ضروری ہے۔

(۳) اخلاقی پہلو سے یہ لوگ جس تبدیلی کے خواہاں ہیں وہ یہ ہے کہ عورت شرم و حیا اور عصمت و عفت کے رسوم و قیود میں جکڑی ہوئی رہنے کے بجائے "مادر آزادی" کی پاکستان اکاڈمی آف آرٹ میں جاکر جسم بنانے اور جسمانی حرکات میں موافقت و ہم آہنگی پیدا کرنے کا فن سیکھے، تال، سُر اور جسمانی انضباط کا شعور پیدا کرے کتھک ناچ کو، جو مسلمانوں کا خاص ناچ ہے اور جسے اب ہندوؤں نے اپنا رکھا ہے، ہندوؤں سے واپس لے اور اکابر شاہان مغلیہ کے اس ورثہ کو اس کے شایان شان ترقی دے۔ گانے بجانے میں، جو مغلوں کے دور میں لڑکیوں کی تربیت کا ضروری جز رہا ہے، کمال پیدا کرے۔ اور بین الاقوامی نمائش فنون میں جو آئندہ لندن میں منعقد ہو رہی ہے پاکستان کو دنیا کے تہذیبی نقشہ (Cultural Map) پر چمکا دے۔ صرف ایک شوہر تلاش کر لینا اور اس کی اطاعت و وفاداری اور بچوں کی پرورش و نگہداشت میں پوری زندگی کھپا دینا ان حضرات کے نزدیک نہ کوئی مقصد زندگی ہے اور نہ باپ بھائی یا شوہر کی کمائی پر صبر و شکر کی زندگی گزار دینا عورت کے لئے کوئی قابل تعریف بات۔ ان حضرات کے نزدیک عورت کی اصل قدر و قیمت اس بات میں ہے کہ قدرت نے اس کو جن اسلحہ سے مسلح کیا ہے ان سے لیس ہو کر گھروں کی چار دیواری سے باہر نکلے، ہالی وڈ کے ذوقین و ذوآفات کی طرح اپنے کمالات فن دکھائے، دلوں کو تسخیر کرے، محفلوں میں نمایاں ہو، مجلسوں میں داد تحسین حاصل کرے۔ سوسائٹی نے اگر اس آزادی پر کچھ اخلاقی اور شرعی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں تو ان سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو سوسائٹی اتنی معمولی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتی کہ موجودہ وقت کے تقاضے کچھ اور ہیں اور اب ماضی کی روایات اپنے اوپر لادے لادے پھرنا ممکن نہیں ہے، وہ سوسائٹی اس قابل نہیں ہے کہ اس کی باتوں پر کان دھرا جائے۔ ان حضرات کے نزدیک قدرت کی طرف سے تو ہر عورت ہر مرد کے لئے "کھلی ہوئی" ہے، صرف حسن معاشرت کے خیال سے انسان نے از خود اپنے اوپر ازدواج و مناکحت کی پابندیاں عائد کر لی ہیں، اگر اب حسن معاشرت کا مطالبہ یہ ہو کہ ہر عورت مرد کے لئے پھر سے کھول دی جائے تو انسان اپنی عائد کردہ پابندی اٹھا بھی سکتا ہے یا کم از کم اس کو کسی دوسری شکل میں تبدیل کر سکتا ہے۔ ان بزرگوں کے خیال میں عصمت فروشی بجائے خود کوئی برائی نہیں ہے۔ برائی اگر ہے تو عصمت فروشی میں بیباکی سے کام لینا ہے۔ اور یہ بھی غالباً اس لئے بُرا ہے کہ اس سے لوگوں

کو کچھ منفرد و غلط مثالیں مل جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ عورتوں کی آزادی کے معاملہ میں ذرا متذبذب ہو جاتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ حق بحق دار رسید کا معاملہ خواہ کسی طرح بھی ہو، بجائے خود تو قابل اعتراض ہو ہی نہیں سکتا۔

نظام اسلامی کے قیام کا دعویٰ یہ خلاصہ ہے اس پیش نظر انقلاب کا جو ہمارے ارباب حل و عقد ہماری خواتین کی زندگیوں میں برپا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے یہ خلاصہ بیشتر خود انہی کے یا ان کے نمائندوں اور کارندوں کے الفاظ میں یہاں رکھ دیا ہے تاکہ جو کچھ یہ حضرات چاہتے ہیں وہ بیک نظر خود پیش کرنے والوں ہی کے الفاظ میں ناظرین کے سامنے آجائے۔ پچھلے صفحات میں ہر چیز کے دلائل و شواہد پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں تاکہ اگر اس کے کسی فقرہ کی صداقت میں کسی صاحب کو کچھ تردد ہو تو وہ اس کے اصل ماخذ کو بغیر زحمت کے معلوم کر سکیں۔

یہ ہے وہ اسلامی نظام جو ہمارے ارباب کار اس ملک میں قائم فرمانا چاہتے ہیں اور جس کی تیاری میں وہ رات دن سرگرم ہیں۔ یہی ہے وہ چیز جس کی نسبت ہمارے وزیر اعظم صاحب نے فرمایا:۔

"پاکستان اس غرض کے لئے حاصل کیا گیا ہے تاکہ دنیا کو اسلامی اصولوں پر قائم ریاست کا نمونہ دکھایا جا سکے"۔

(سول اینڈ ملٹری گزٹ ۲۵ جنوری ۱۹۴۹ء)

یہی ہے اس اسلامی حکومت کا تہذیبی نقشہ جس کی نسبت ہمارے وزیر اعظم نے ۸ دسمبر ۱۹۴۹ء کو کوہاٹ ضلع مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں فرمایا کہ اگر وہ پاکستان میں قائم نہیں کی گئی تو پاکستان زندہ نہیں رہ سکے گا۔

"جہاں تک لوگوں کی اس امنگ کا تعلق ہے کہ پاکستان میں اسلامی اصولوں کے مطابق حکومت چلائی جائے، دستور ساز اسمبلی کی پاس کردہ قرارداد مقاصد اس کی کافی ضمانت ہے میرا یہ ایمان ہے کہ اگر ہم نے پاکستان میں اسلامی حکومت قائم نہ کی تو پاکستان زندہ نہیں

رہ سکے گا........ ہم دنیا کو یہ دکھانے داعیہ رکھتے ہیں کہ فقط اسلام ہی وہ اصول زندگی ہے جو دنیا کے موجودہ مصائب کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

(پاکستان ٹائمز لاہور مورخہ ۹ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

یہی ہے وہ اسلامی نظام جس کا ذکر ہمارے وزیراعظم صاحب نے ۲۵ر نومبر ۱۹۴۹ء کو کراچی میں بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے ان شاندار الفاظ میں فرمایا :-

"پاکستان بس ایک اور صرف ایک ہی ارزو رکھتا ہے اور اس کی وہ آرزو ہے خدمت اسلام اور خدمت بنی نوع انسان........ میرا یہ محکم یقین ہے کہ آج دنیا جن مشکل مسائل سے دوچار ہے ان کو صرف اسلام ہی حل کر سکتا ہے کیونکہ اسلام انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو مذہب کے اور دوسرے کو دنیا کے حوالے نہیں کرتا۔ وہ اپنے پیروؤں کی پوری زندگی ——— انفرادی ہو یا اجتماعی ——— اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ وہ ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کے حوالے کر دینا اس کی تعلیم ہے"۔

(ڈان کراچی مورخہ ۲۶ر نومبر ۱۹۴۹ء)

یہی ہیں اسلام کے وہ بہتر اصول جن سے بہتر اصول دنیا پیدا نہیں کر سکی۔ اور جن کے مطابق پاکستان کی حکومت کو بنانے کا عزم وزیراعظم صاحب نے ان پرشوکت الفاظ میں فرمایا :-

"میں نے حصول پاکستان سے قبل مسلمان رائے دہندگان سے جو وعدے کئے تھے میں انہیں بھولا نہیں ہوں، ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس بنا پر کیا تھا کہ مسلمان اپنی زندگی اسلامی احکام کے قالب میں ڈھال سکیں۔ ہم نے ایک ایسے مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا جہاں ایک ایسی حکومت بنائی جا سکے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو جن سے بہتر اصول دنیا پیدا نہیں کر سکی۔ اس مقصد کے لئے ہزارہا مسلمانوں نے اپنی زندگیاں قربان تقریباً ستر لاکھ مسلمانوں نے اسی مقصد کے لئے، اپنا گھر بار چھوڑا اور مرتے کٹتے پاکستان تک پہنچے۔ ہم نے مسلمان عوام سے جو وعدہ کیا تھا اب ہمیں اسے پورا کرنا ہے اور ایک ایسی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

حکومت کرنی ہے جس کا نصب العین سچا اسلامی نصب العین ہو۔ دنیا کو آج اسلام کی ضرورت ہے"

(نوائے وقت ۸ ر فروری ۱۹۵۰ء)

یہی ہے اسلام کا وہ مستقل نظام حیات جو ہمارے وزیر خزانہ ملک غلام محمد صاحب نے مدت العمر کے مطالعہ کے بعد دریافت فرمایا ہے اور جس کی تعیین وہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"ہمارا ایک مستقل نظام حیات ہے، ہمارا ایک الگ تمدن ہے، ہمارے اپنے طور طریقے ہیں اور ہم انہی کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سب اسلامی اصولوں کے مطابق متحد ہونا اور انہی کے ذریعے عروج حاصل کرنا چاہتے ہیں"

(پاکستان ٹائمز لاہور مورخہ ۸ ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

اور یہی ہے مقدس پیغمبرؐ کا وہ طریقہ جس کی طرف واپس آنے کی تلقین بیگم لیاقت علی خان اور ان کے زمرہ کی دوسری بیگمات میلاد کی مجلسوں میں مسلمان عورتوں کو فرمایا کرتی ہیں۔

یہ حضرات اگر یہ فتنہ تنہا اپنے بل بوتے پر اٹھاتے اور اسلام کو اس بیچ میں نہ گھسیٹتے تو جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا ہے یہ چیز کچھ ایسی تشویش انگیز نہیں تھی۔ ہزار جہالت کے باوجود ابھی ہماری قوم میں اتنی اخلاقی و مذہبی حس باقی ہے کہ آسانی کے ساتھ اس راستہ پر نہیں جا سکتی جس پر یہ حضرات اس کو ڈال دینا چاہتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہالی وڈ کی اس تہذیب کو مدینہ کے اور صحابہ کی تہذیب کے نام سے اس سراسر جاہلی اور شیطانی نظام معاشرت کو اسلامی نظام معاشرت کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے

لے اب یہ گواہی ان ستر لاکھ مہاجرین کے ذمہ ہے جو مرتے کھپتے پاکستان پہنچے ہیں کہ کیا واقعی انہوں نے اپنی جان مال آبرو اسی بے نشانی اور اپنے گھر بار اسی لئے چھوڑے کہ وہ ہندوستان میں اپنی عورتوں کو بے پردہ کرنا چاہتے تھے اور انہیں اس "اسلامی تہذیب" اور ان "اسلامی احکام" پر عمل کرنے سے روک رہے تھے؟

لے بہتر ہو گا اگر ناظرین ۹ ر فروری ۱۹۵۰ء کے ڈان میں آذوری صاحبہ کے اس رقص کے اشتہار پر بھی ایک نظر ڈال لیں جس کے آنریبل وزیر خزانہ کے زیر سرپرستی انعقاد کا اعلان ہوا ہے اس سے یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ اسلامی اصولوں کے مطابق عروج حاصل کرنے کا عملی طریقہ کیا ہے؟

جس کی وجہ سے دین سے بے خبر مسلمانوں کا ایک طبقہ اور ان کی عورتیں اس فتنہ کا شکار ہو رہی ہیں اور اندیشہ ہے کہ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی اس میں مبتلا ہو جائیں۔ اس وجہ سے ہم ان حضرات کے اس مطمح نظر انقلاب کے ان تینوں پہلوؤں پر جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں تنقید کر کے دکھینگے کہ جس اسلام اور جس اسلامی نظام کی محبت میں یہ لوگ چور ہیں کیا فی الواقع وہ مساوات مرد و زن کے اس نظریہ اور ان معاشرتی و اخلاقی تصورات کو کسی درجہ میں بھی قبول کرتا ہے جن کو ہمارے یہ ارباب کار اس زعم اور اس ڈھٹائی کے ساتھ اسلام کے نام سے پیش کر رہے ہیں؟